سلسلہ کتب علوم الیوم برائے غیر عربی دان

سلسلة تفقيه طالب علم ونصاب مدارس

الحمدللہ!! پہلی قسط ۵ مجلدات میں

Volume
3/5

اسلامی نظامِ اقتصادیات برائے قدیم وجدید معاملات مالیہ

(قدیم وجدید اصولی فقہی مباحث کا مجموعہ)

Islamic Economic System
to solve the ancient & contemporary affairs

الحقيبة الإقتصادية

نظام الاقتصاد الإسلامي لحل المعاملات المالية القديمة والمعاصرة

اعداد واشراف مجموعہ اسلامی اقتصادیات:

شیخ ارشد بشیر عمری مدنی سلمہ اللہ

Shaikh Arshad Basheer Umari Madani
Hafiz, Aalim, Faazil (Madina University, KSA), MBA.
Founder & Director of AskIslamPedia.com
Chairman: Ocean The ABM School, Hyd.
+91 92906 21633 (whatsapp only)

مجموعہ اسلامی اقتصادیات

1. فقه المعاملات المالية المعاصرة
2. منحة العلام – كتاب البيوع
3. قواعد في البيوع
4. علوم البيوع
5. منظومة القواعد الفقهية

ABM PrintTime

3

عن الكتاب

نام کتاب:	قواعد في البيوع
مؤلف:	د. سليمان بن سليم الله الرحيلي
سنِ طباعت:	1432هـ – 2011 م
ناشر:	الآجري
ملک:	المملكة العربية السعودية
اعداد و اشراف:	شیخ ارشد بشیر عمری مدنی سلمہ اللہ
فریق الترجمہ والمراجعہ:	شیخ معاذ عمری و علماءِ آسک اسلام پیڈیا حفظہم اللہ (AskIslamPedia.com)

ABM Print Time

قواعد في البيوع

ABM PrintTime

فہرست

- پہلا مقدمہ – قواعد فقہیہ
- دوسرا مقدمہ – بیع کی تعریف
- پہلا قاعدہ – "الأصل في البيوع الإباحة"
- دوسرا قاعدہ – "العبرة في العقود للمقاصد والمعاني لا للألفاظ والمباني"
- تیسرا قاعدہ – "القصود مؤثرة في العقود"
- چوتھا قاعدہ – "إنما البيع عن تراض"
- طلبہ کے سوالات

ABM PrintTime

بسم الله الرحمن الرحيم

إن الحمد لله، نحمده ونستعينه ونستغفره، ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا، من يهد الله فلا مضل له، ومن يضلل فلا هادي له، وأشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له، وأشهد أن محمدا عبده ورسوله.

﴿يا أَيُّها الَّذين آمَنوا اتَّقُوا اللَّه حقَّ تُقَاته ولَا تَمُوتُنَّ إِلا وأَنْتَم مُسْلمُونَ﴾(آل عمران: 20)۔

﴿يا أَيُّها النَّاس اتَّقُوا ربَّكُم الَّذي خلَقَكُم منْ نَفْسٍ واحدَة وخلَق منْها زوجها وبثَّ منْهما رِجالًا كَثيرا ونساء واتَّقُوا اللَّه الَّذي تَساءلُونَ به والْأَرحام إِنَّ اللَّه كَانَ علَيكُم رقيبا﴾(يوسف: 20)۔

﴿يا أَيُّها الَّذين آمنوا اتَّقُوا اللَّه وقُولُوا قَولًا سديدا* يصلح لَكُم أَعمالَكُم ويغْفر لَكُم ذُنُوبكُم ومن يطعِ اللَّه ورسولَه فَقَد فاز فَوزا عظيما*﴾(يوسف: 70- 71)۔

أما بعد:

فإن أحسن الحديث كتاب الله، وخير الهدى هدي محمد صلى الله عليه وسلم، وشر الأمور محدثاتها، وكل محدثة بدعة، وكل بدعة ضلالة، وكل ضلالة في النار.

کسی مسلم بندے میں وجود خیر ہونے کی علامت یہ ہے کہ اللہ تعالی اس شخص کو تفقہ فی الدین کی طرف راغب کردے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «مَنْ يُرِد اللَّهُ به خَيْرًا يُفَقِّهْهُ في الدِّين»[1] اور مسلمان کے لئے دین میں فقہ حاصل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ صحیح علم حاصل کرے، صحیح عقیدہ پڑھے، اور اس علم صحیح پر عمل پیراہو جائے۔ الفقہ فی الدین کا یہی مطلب ہوتا ہے، علم صحیح سے ہی صحیح عقیدہ ملتاہے، اور عمل صالح بھی اسے پر منحصر ہے، اس علم صحیح سے ہی کسی بھی شے کا مالہ وماعلیہ معلوم کیا جاسکتا ہے۔

علوم دینیہ کی مختلف انواع ہیں، ان میں سے ایک شرعی احکام سے متعلق فقہ حاصل کرنا بھی ایک نوع ہے۔ اور یہ علم اللہ تعالی کے دین کے حصول میں نہایت محمود گردانا گیاہے۔

[1] - صحيح البخاري: كتاب العلم، باب من يرد الله به خيرا يفقهه في الدين. برقم: 69

ABM PrintTime

اس میں کوئی شک نہیں کہ فقہ کی روح اوراس کا عظیم رکن " دلیل " ہے، علم صحیح کتاب وسنت پر مبنی ہوتا ہے، اور دلائل کا مطلب ہی یہ ہے کہ کسی امر سے متعلق کتاب وسنت سے اس کو مدلل کیا جائے۔

دلائل کا امت محمدیہ کے حق میں درحقیقت سفینہء نوح کا درجہ ہے، جوکہ نجات اور کامیابی کا ضامن ہے، اور سارے ہی مسلمان اپنی زندگی کے سارے امور میں دلائل کے محتاج ہیں، البتہ فقہ کے باب میں اس کی احتیاج زیادہ رہتی ہے، اس لئے کہ فقہ میں اختلاف رائے اوراقوال زیادہ ہوتے ہیں، ایسی صورت میں دلائل پر تمسک سے ہی نجات ملتی ہے، اور دلائل کومعیار ماننے کے ساتھ معتبر اہل علم کے فہم سے اخذ کرنا چاہیے، ہمارے ان معتبر اہل میں سرفہرست ہمارے اسلاف ہیں۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

اور جب ایک طالب علم اہل علم کی سیرت کا مطالعہ کرے گا، بالخصوص ائمہ اربعہ کا (امام ابوحنیفہ نعمان، امام دارالہجرہ امام مالک بن انس، امام محمد بن ادریس القرشی الشافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ جمیعا) تووہ ان کی سیرت کے مطالعہ میں یہی پائے گا کہ ان کی سمجھ اور فقہ دلیل پر مبنی ہوا کرتی تھی، اوران کا مصدر اور ماخذ علم دلیل ہی ہوتی تھی، اس میں عجب بھی نہیں ہے کیونکہ ہم نے ان سب کو دلیل پر ہی گفتگو کرتے ہوئے پایا ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اہل علم کا اس بات پر اجماع ہے کہ اگر کسی کو کسی امر میں سنت سے مسئلہ ثابت ہوجائے تووہ اس کے ہوتے ہوئے کسی کے قول کی وجہ سے چاہے وہ جو کوئی بھی ہو تو اس کے لئے زیب نہیں دیتا کہ وہ سنت کو چھوڑدے۔([2]) یہاں امام شافعی رحمہ اللہ جوکہ اہل علم کے اقوال پر گہری نگاہ رکھتے ہیں آپ نے ان سبھوں کا اجماع لکھاہے، اوراس پر وافر مقدار میں نصوص بھی موجود ہیں، خلاصہ کلام یہ ہے کہ ان اہل علم کی صحیح اتباع یہ ہے کہ طالب علم ان کے اقوال پر اس وقت عمل کرے جب ان کا قول دلیل صحیح سے مدلل ہو۔

اور جو طالب علم کسی کے قول کو دلیل صحیح سے مدلل پائے تو وہ اس بات کا بھی لحاظ رکھے کہ اس کے برخلاف جو اہل علم ہیں ان کو معذور جانے، اس لئے کہ معتبر اہل علم میں ایسے کوئی بھی نہیں ہیں کہ وہ دلیل صحیح سے عمدا پہلو تہی برتتے ہوں۔

دراصل یہی صحیح سالم منہج ہے جس کی طرف ہم لوگوں کو دعوت دیتے ہیں، ائمہ اسلام کی برتری بھی اسی سے معلوم کی جاتی ہے، ان کے علو مرتبت کا اعتراف، ان کے حق میں ترحم اور دعا سب اسی پر منحصر ہے، تعصب ان کے قول کے لیے نہیں ہونا چاہیے بلکہ دلیل کا طرفدار ہونا چاہیے، یوں ایک طالب علم کو چاہیے کہ کسی کے قول کے بجائے دلیل پر نظر رکھے، ہاں اہل علم کی فہم بہرحال مقدم ہونا چاہئے۔

---

[2] - حافظ ابن القیم رحمہ اللہ اپنی کتاب " الروح" اور دیگر مقامات میں اس قول کو امام شافعی رحمہ اللہ کی طرف منسوب کیاہے۔

ABM PrintTime

اور اس میں شک نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی وصیت تھی، اور اس کو انجام دینے والے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس وصیت کو انجام دینے والے ہیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «فَإِنَّهُ من يعش منكم بعدي فسيرى اختلافًا كثيرا، فعليكم بسنَّتي وسنَّة الخُلفاء المهديين الرَّاشدين، تمسَّكوا بها وعضُّوا عليها بالنَّواجذ، وإيَّاكم ومحدثات الأُمور، فإنَّ كلَّ محدثة بدعة»[3] آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول پر غور فرمائیں کہ آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ تم میرے بعد بہت سا اختلاف پاؤ گے، ایسی صورت میں میری اور خلفائے راشدین کی سنت کو لازم پکڑو، سوائے فقہی مسائل کے اس میں تمہارے لئے تقلید واجب ہے، بلکہ آپ نے عام اور واضح حکم ارشاد فرمایا جس میں کسی طرح کا کوئی نقص نہیں رہ گیا۔

وہ یہ کہ نجات صرف دلیل صحیح پر ہے، اختلاف کی صورت میں جو جس دلیل کو قوی اور درست سمجھے گا وہ اس پر قائم رہے، اور جو شخص دلیل کی معرفت نہیں رکھتا یا اس تک پہنچ پر قادر نہیں ہے اس کو چاہیے کہ اہل علم سے دریافت کرے تا کہ وہ دلیل کے ذریعے اس کو راہ حق کی طرف ارشاد کر سکے۔

ہم اس دورے میں جو دورہ امام دار الہجرہ – اللہ تعالی آپ کو اہل اسلام کی طرف سے اس کا بہترین اجر عطا فرمائے – منعقدہ مدینہ نبویہ اور یہ مسجد جس میں یہ دورہ منعقد ہوا ہے جو لوگوں کے ہاں مسجد قبلتین سے جانی جاتی ہے، تو ہم اس دورے میں اللہ تعالی سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہم سب کو اخلاص نیت عطا فرمائے، علم نافع دے۔ بہر حال اس دورے میں ان شاء اللہ ہمارے لئے دو درس ہوں گے:

اس میں سے ایک ان شاء اللہ کل صبح ساڑھے سات بجے شروع کیا جائے گا، اور وہ شیخ عبد الرحمن السعدی رحمہ اللہ کا قواعد فقہیہ سے متعلق منظوم رسالہ کی تکمیل ہے۔

اور دوسرا درس ابھی بعد از عصر سے پونے پانچ تک ہو گا، جس میں ان شاء اللہ ہم بیوع سے متعلق کچھ قواعد پر گفتگو کریں گے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک مسلمان فقہ البیوع سے متعلق معلومات کا بہت ہی محتاج ہے، کیونکہ کوئی بھی مسلم خرید و فروخت سے بے نیاز نہیں ہو سکتا ہے، بلکہ کوئی دن بھی اس سے خالی نہیں ہوتا ہے، اور طلبہ اس کے اور بھی زیادہ محتاج ہوتے ہیں، کیونکہ اکثر لوگوں کے سوالات اسی سے متعلق ہوا کرتے ہیں، اور امور فقہیہ میں کلام کرنے والے حضرات میں ہم دیکھتے ہیں کہ وہ عبادات میں وہ تساہل نہیں برتتے جو معاملات میں برتتے ہیں۔

---

[3] - امام ابو داود رحمہ اللہ نے اس روایت کو اپنی سنن کی کتاب السنہ میں باب فی لزوم السنہ کے تحت لائے ہیں۔ حدیث نمبر: ۴۶۰۷، اور امام ترمذی اور ابن ماجہ رحمہما اللہ نے بھی اپنی اپنی سنن میں لائے ہیں، شیخ البانی رحمہ اللہ نے صحیح کہا ہے۔

ABM Print Time

اسی لئے طلبہ پر ضروری ہے کہ وہ دلیل کی اہمیت کو جانیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کے مقام علیا کو سمجھیں، اور فقہ المعاملات کی جانکاری میں اپنے آپ کو خوب خوب کھپائیں، اور معاملات میں سے عظیم فقہ البیوع ہے، بہر صورت یہ ہمارے لئے مناسب ہے کہ ہم کچھ بیوع سے متعلق قواعد کا ذکر کریں جسے اہل علم نے کتب الفقہ یا قواعد فقہیہ سے متعلق کتابوں میں ذکر فرمایا ہیں، تا کہ ہم اس پر گفتگو کریں اور ان شاء اللہ عصر حاضر کی بیوع سے متعلق معاملات سے اس کو جوڑیں۔

اور طریقہ ءعلمیہ کا تقاضا یا یہ ہے کہ ہم ان دروس کو دو مقدموں سے آغاز کریں:

پہلا مقدمہ: قواعد فقہیہ سے۔

اس مقدمے میں ہم نہایت ایجاز سے کام لیں گے، اس لئے کہ اس سے قبل والے بہت سے دروس میں قواعد فقہیہ کا بہت زیادہ ذکر ہو چکا ہے، جو کہ قواعد فقہیہ کی تشریح میں ہم نے دروس دئے ہیں، اس لئے اختصار سے ہم یہاں پیش کریں گے۔

رہا دوسرا مقدمہ: وہ بیوع کی تعریف اور وہ لازمی صفات کا بیان جس کے وجود سے ہی ہم بیع کہہ سکتے ہیں۔

اس پر بھی ہم بقدر ضرورت اور حسب مقام ہی گفتگو کریں گے۔

ABM Print Time

پہلا مقدمہ

قواعد فقہیہ

ABMPrintTime

قواعد فقہیہ کی تعریف: قواعد فقہیہ سے مراد کیا ہے؟ دراصل قواعد فقہیہ یہ مختصر سے کلمات ہوتے ہیں جو بہت سارے مسائل پر بطور حکم کے منبطق ہوتے ہیں۔

مختصر کلمات:

قواعد میں یہ ضروری ہے کہ کلمات مختصر ہوں، ان قواعد کی بابت یہ درست نہیں کہ جملے نثر کی طرح ہوں، عبارات کا مختصر ہونا ضروری ہے، ایک دو کلمات پر مبنی ہونا چاہیے، یا ایک دو سطر تک میں پوری بات آجانی چاہیے اس سے متجاوز نہیں ہونا ہے۔

اور یہ مختصر کلمات اپنے لفظوں میں درج ذیل امور کو محیط ہونا چاہیے:

حکم:

سننے میں اس کی معرفت ہو جائے، کہ یہ قاعدہ اس امر کے لئے ہے۔

اس قاعدہ کا فقہی ہونا بھی ضروری ہے۔ اوراس قاعدہ میں یہ عنصر کا ہونا بھی ضروری ہے کہ یہ عام ہو، ایسا نہ ہو کہ ایک یا دو مسئلوں سے متعلق ہی رہ جائے۔ اوراس قاعدہ کا بہت سارے مسائل پر منطبق ہونا ضروری ہے۔

مثلا قواعد سے متعلق اہل علم ایک قاعدہ بیان کرتے ہیں: "الأمور بمقاصدها "اگر ہم اس کے صیاغہ پر غور کریں تو یہ بات واضح ہے کہ یہ نہایت ہی مختصر ہے، اگر اس کے الفاظ پر غور کریں تو اس میں ایک حکم ملتا ہے، اور یہ حکم بھی عام ہے، اور سارے ہی امور اس کے مقاصد پر قائم ہیں، اور دسیوں مسائل پر اس کا انطباق ہوتا ہے۔

قواعد فقہیہ کی دقیق تعریف یہ ہے جو قواعد فقہیہ کے متخصصین اس کی تعریف میں کہتے ہیں: حكم كلي يتعرف منه حكم الجزئيات الفقهية مباشرة.

جب ہم "كلي "کلمہ سنتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جس میں کل اور سارے جیسے لفظ سے بات کا آغاز کیا جاتا ہے، جیسے ہم یہ کہیں: آج سارے ہی طلبہ قاری ہیں، ہمارا "سارے" کہنا یہ کلی کہلاتا ہے۔

لیکن اگر یہ کہیں کہ سارے ہی طلبہ توفیق الہی سے بہرہ ور ہیں تو یہ بات "کلی" نہیں کہلائے گی، اس لئے کہ سارے ہی طلبہ امور خیر کی طرف نہیں لپکتے ہیں، اور نہ انہیں اس کی توفیق دی جاتی ہے، کچھ تو شر کا ذریعہ بن جاتے ہیں اور سنت کے خلاف بر سرپیکار رہتے ہیں، بدعات کو نشر کرتے ہیں، اہل السنہ سے بیزار رہتے ہیں، ان سے محاربت کرتے ہیں اور ان کی شخصیات میں ردوقدح سے کام لیتے ہیں، اور اہل السنہ کے خاتمے کی ہر جگہ کوشش میں رہتے ہیں، ہاں وہ اپنی دانست میں بہت ہی مجتھد طالب علم گردانتے ہیں، تو ایسا کہنا "کلیہ" نہیں کہلاتا ہے، اس لئے کہ اس میں "سارے" والی بات نہیں آتی ہے۔

ABM Print Time

ہاں تو اہل علم جب یہ کہتے ہیں کہ " حكم كلي " تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس میں اس بات کی صلاحیت ہوتی ہے کہ یہ کل امور پر مشتمل ہوتا ہے۔

قواعد فقہیہ میں اس لفظ " کل " سے ابتدا کی جاتی ہے، اس لئے کہ جو اس سے خارج ہو جائے وہ قواعد فقہیہ میں داخل نہیں ہو سکتا ہے۔

اب جب کہ ہر قاعدہ کے لئے کچھ مستثنیات ہوتے ہیں، اس میں بھی ہیں جس کی وجہ وہ قاعدہ میں داخل نہیں ہوتے تو اس استثنا کا ہونا اس اصل پر کچھ آنچ نہیں آئے گی۔

قواعد فقہیہ کی یہ تعریف: "حكم كلي يتعرف منه حكم الجزئيات الفقهية مباشرة "

اہل علم کے نزدیک معروف "الضوابط الفقهية" کو بھی شامل ہے۔ اس لئے کہ ضوابط اصل میں قواعد ہی ہیں، البتہ یہ باب مستقل پیش کیا جاتا ہے، کچھ اہل علم اس کو قواعد سے الگ رکھتے ہیں، اگر آپ اس کا اخراج چاہتے ہیں تو اس کی تعریف میں اس کا اضافہ کر دیجئے: "اکثر مسائل یا اکثر باب میں " جس سے ضوابط اس میں داخل نہیں ہوتے ہیں۔ اور اگر آپ اس کو داخل کرنا چاہتے ہیں تو اس کا اضافہ نہ کریں، یہ تو تفریق محض ان دونوں میں تمیز کے لئے ہے کیونکہ اس علمی طور سے کوئی اثر پڑنے والا نہیں ہے۔ ضوابط خود مستقل ایک باب ہے لیکن عملا قواعد ہی ہیں، قواعد البیوع سے متعلق گفتگو میں ہم اسی منہج کو سامنے رکھ کر آگے بڑھیں گے، یعنی اس میں تفریق روا نہیں رکھیں گے کہ ایک باب شرعی سے متعلق کیا ہے اور مختلف ابواب سے تعلق رکھنے والا قاعدہ کیا ہے؟

قواعد فقہیہ کے مقدمہ میں اس بات کی طرف اشارہ کرنا لازم ہو جاتا ہے کہ قواعد فقہیہ اور اصول فقہ میں کیا بنیادی فرق ہے؟

اہل علم کے نزدیک یہ مسلم بات ہے کہ قواعد فقہیہ اور اصول فقہ میں واضح فرق ہے، یہ مستقل ایک فن اور وہ ایک مستقل باب علم ہے، ان دونوں میں بہت سے فروق پائے جاتے ہیں البتہ ہم ان میں سے دو فرق بیان کریں گے جو بہت زیادہ واضح ہیں:

1)- ان میں سے ایک یہ ہے کہ قواعدہ فقہیہ میں کوئی بھی قاعدہ اپنے لفظ اور صیاغہ میں ایک ایسا حکم رکھتا ہے جس سے براہ راست کئی احکام معلوم کئے جاتے ہیں۔

اور قواعد اصولیہ میں ایسا کوئی صیاغہ نہیں ہوتا جس میں براہ راست احکام معلوم کئے جائیں۔

بطور مثال کہ: ایک فقہی قاعدہ ہے: "اليقين لا يزول بالشك" اس قاعدہ کی روسے بہت سارے فقہی احکام معلوم کئے جاتے ہیں، اگر کوئی شخص ہمیں یقین اور شک سے متعلق سوال کرے تو ہم یہ قاعدہ "اليقين لا يزول بالشك" پیش کر دیں گے۔ ہم سے اگر کوئی سوال کرے کہ میں نے عصر کی نماز پڑھی اور اس شک میں ہوں کہ میں نے سجدہ ترک کر دیا؟ تو ہم جواب میں عرض کریں گے کہ آپ

ABM PrintTime

نے نماز مکمل کر دی ہے بس سجدہ سے متعلق شک میں ہیں، تو اصل یقین کو محض یہ شک ختم نہیں کرے گا،یوں آپ کی نماز درست اور صحیح ہے۔

رہا اصولی قاعدہ مثلا:"الأمر للوجوب" اس میں ایسا لفظ نہیں ہے جو اپنے اندر حکم رکھتا ہو اور اس سے کئی امور میں احکام معلوم کئے جاتے ہوں۔ اگر ہم سے کوئی سائل کسی بھی امر میں کوئی سوال کر دے تو ہم کہنے کے مجاز نہیں کہ یہ واجب ہے، اور کہیں امر وجوب کا تقاضا کرتا ہے۔

یعنی کوئی شخص ہم سے سیدھے ہاتھ سے کھانے سے متعلق حکم معلوم کرے، تو جواب میں ہم یہ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ سیدھے ہاتھ سے کھانا واجب ہے کیونکہ امر وجوب کا تقاضا کرتا ہے۔

وہ آپ کی بات کسی طور سے بھی نہیں سمجھ پائے گا،ہاں اگر آپ اس کو امر اور اس کے صیغے سے متعلق معلومات فراہم کریں یا وہ اس کو جانتا ہو تو ہم اس سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ سیدھے ہاتھ سے کھانا واجب ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «إِذَا أَكَلَ أَحَدُكُم فَلْيَأْكُلْ بِيَمِينِهِ»[4] اور یہ «فَلْيَأْكُل» امر ہے، اور امر وجوب کا معنی دیتا ہے، تو اس طرح کی تفصیل مستقل ایک بات ہے۔

2)- دوسرا فرق یہ ہے کہ قواعد فقہیہ امور تکلیفیہ سے متعلق بحث کرتی ہیں، یعنی مکلف مخلوق انسان کے اعمال واقوال سے متعلق ہوتے ہیں۔

اور قواعد الاصولیہ دراصل یہ شرعی دلائل ہیں۔

اسی لئے قواعد فقہیہ کا جانکار مکلفین کے اقوال واعمال کو اپنا موضوع بناتا ہے اور قواعد اصولیہ کا عالم شرعی دلائل کو اپنا موضوع بناتا ہے۔

قواعد فقہیہ کا عالم جب کہتا ہے:"الأمور بمقاصدها " تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مکلف کے اعمال واقوال کا معاملہ اس کے مقاصد سے تعلق رکھتا ہے۔

اور جب اصولی یہ کہے کہ "الأمر للوجوب" تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالی کا حکم اور امر وجوب پر دلالت کرتا ہے، اور رسول اللہ ﷺ کا امر اور حکم بھی وجوب کا متقاضی ہے، لوگوں کی طرف سے دیا جانے والا حکم اور امر اپنے اندر یہ معنوی قوت نہیں رکھتا ہے۔

---

[4] - صحيح مسلم: كتاب الأشربة، باب آداب الطعام والشراب وأحكامهما. برقم: 3764

اس طرح اصولی حضرات کا عمل عین قواعد اصولیہ کا ہے کہ یہ ادلۂ شرعیہ کو اپنا موضوع بناتے ہیں اور قواعد فقہیہ اعمال المکلفین اور ان کے اقوال کو زیر بحث بناتے ہیں۔

اب یہاں اس مختصر سے مقدمے میں تیسری اور آخری بات قواعد فقہیہ سے متعلق یہ سوال ہے کہ کیا قواعد فقہیہ قابل حجت ہیں؟ کہ کیا قواعد فقہیہ میں اتنی صلاحیت ہے کہ اس سے ایک طالب علم شرعی طور سے حکم معلوم کر سکتا ہے؟ اور کیا یہ قواعد اس حد تک مستند ہیں کہ ان سے احکام شرعیہ مستنبط کئے جاسکتے ہیں؟

تو ہم یہ کہیں گے کہ: بعض اہل علم کی یہ رائے کہ قواعد فقہیہ حجت نہیں ہوسکتے ہیں۔ ہمارا سوال ہے کہ کیوں حجت نہیں ہوسکتے؟ تو جواباً یہ کہتے ہیں کہ قواعد فقہیہ حقیقت میں بشری کلام ہوا کرتے ہیں، اور انسانی کلام حجت کیوں کر ہو سکتا ہے؟ اس کی تفصیل یہ ہے کہ قواعد فقہیہ فقہائے عظام کا کلام ہے، اور صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے بعد کسی کا قول حجت نہیں بن سکتا، اور اس بات پر اہل علم متفق ہو چکے ہیں۔ جب کہ خود صحابی کا قول حجت ہے یا نہیں؟ اس پر اہل علم کے مابین اختلاف واقع ہوا ہے، تاہم اس میں تفصیل ہے، لیکن اس بات پر تو سبھوں کا اتفاق ہے کہ صحابہ کے بعد انفرادی طور سے کسی فرد کا قول دین میں حجت نہیں ہو سکتا ہے۔ تو قواعد فقہیہ بھی بشری کلام ہونے کی وجہ سے حجت نہیں ہوسکتے ہیں۔

کچھ اہل علم نے یہ کہا کہ قواعد فقہیہ حجت ہیں اور ان سے احکام مستنبط بھی کئے جاسکتے ہیں، اور اہل علم کا یہ عمل بھی رہا ہے کہ وہ قواعد فقہیہ سے احکام استنباط فرمایا کرتے آرہے ہیں۔

مذکورہ مسئلہ میں راجح قول یہ ہے کہ اس میں کچھ تفصیل ہے:

1)- کچھ قواعد ایسے ہیں جو عین نصوص کا فائدہ دیتے ہیں۔

2)- اور کچھ قواعد بطور استدلال میں نصوص کے معنی کو ادا کرتے ہیں۔

3)- اور کچھ قواعد قیاسی طور سے استدلال کا کام کرتے ہیں۔

جو قواعد نصوص کا فائدہ دیتے ہیں وہ در حقیقت نصوص سے ہی معنی اور مبنی ہر دو شکلوں میں لئے گئے ہیں۔ یعنی یہ عین نصوص ہی ہیں، جیسے ایک قاعدہ ہے: "لا ضرر ولا ضرار"[5]۔

---

[5] - یہ حدیث کئی ایک صحابہ سے مروی ہے، جن میں: ابن عباس، عائشہ اور عبادۃ بن الصامت رضی اللہ عنہم اجمعین، اس کی تفصیلی تخریج کے لئے

یہ لفظی طور سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت شدہ ہے، اوراس کے نتیجہ میں معنا بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشکاۃ سے لئے گئے ہیں۔

ایک اور قاعدہ یہ "الخراج بالضمان "([6])۔ہے، الفاظ اور پھر اوراس کا معنی دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست لئے گئے ہیں، ایسے میں یہ نصوص کا سا معاملہ برتتے ہیں، ان سے استدلال کیا جاسکتا ہے، اوران سے مسائل مستنبط کئے جاسکتے ہیں۔

اب رہی دوسری قسم ،یعنی کچھ ایسے قواعد جو معنا نصوص کا معاملہ کرتے ہیں، یہ ایسے قواعد ہوتے ہیں جو معنی کے اعتبار سے نصوص ہی ہوتے ہیں یعنی نصوص سے ماخوذ ہوتے ہیں البتہ الفاظ اور صیاغہ فقہاء کی طرف سے ہوتا ہے، اسی لئے اہل علم کے اتفاق کے ساتھ اس سے احکام شرعیہ معلوم کئے جاسکتے ہیں ان سے استدلال اور استنباط کیا جاسکتا ہے، اوراہل علم کے ہاں یہ مسئلہ بھی ہے کہ اگر نصوص کو معنا پیش کیا جائے تو وہ بھی منصوص مانے جائیں گے اوران سے استدلال کیا جاسکتا ہے۔

اور رہے ایسے قواعد جن سے قیاسًا استدلال کا معاملہ کرتے ہیں، یہی قواعد اہل علم کے ہاں " القواعد الاستقرائیہ " کے نام سے جانے جاتے ہیں، جنہیں اہل علم نے فقہی مسائل میں تتبع کرکے وضع کیے ہیں، ایسے قواعد کا حکم قیاس کا ہی ہوگا، ان قواعد کے احتجاج میں وہی شروط پیش نظر ہوں گے جو شروط کے قیاس کے لئے ہوا کرتے ہیں، اور فقہی امور میں ان کی حیثیت اور ضرورت مضطر اور پریشان حال کے حق میں مردار کی ہوتی ہے، اس لئے کہ نصوص کی موجودگی میں اس سے استدلال نہیں کیا جاسکتا ہے، تو فقیہ اگر کسی مسئلہ میں نص نہیں پاتا ہے تو وہ اس قاعدہ کی رو سے احتجاج کرسکتا ہے، اور یہ رعایت الحاق النظیر بنظیرہ کے باب سے ہے۔

یہ رہا قواعد فقہیہ کا مختصر سا تعارف۔

"الصحیحة " : (250) کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔

[6] - اصحاب کتب ستہ میں سے سوائے ابن ماجہ کے سبھی مولفین اس حدیث کو ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کئے ہیں، اور شیخ محمد ناصر الدین الالبانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو "الإرواء " میں صحیح قرار دیا ہے۔

"الصحیحة " : (250) کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔

دوسرا مقدمہ

بیع کی تعریف

ABM PrintTime

یہ بہت ہی اہم مبحث ہے، اس لئے کہ یہ فقہ البیوع کی چابی ہے، اس لئے یہ ضروری ہے کہ ہم یہ جانیں کہ بیع کیا ہے، تاکہ اس تعریف کو سامنے رکھ کر ہم احکام سمجھ سکیں، اور اس لئے بھی کہ محض لوگوں کے کہنے سے کوئی بیع بیع نہیں ہو جاتی ہے، علمائے اسلام کے ہاں بیع کیا ہے اس کو جاننا چاہیے۔

لغت میں بیع کا معنی: اس کا معنی ہے ایک شے کا دوسری شے سے تبادلہ کرنا۔

اور یہ اصطلاحی معنی میں بیع اور قرض دونوں کو شامل ہے، اس لئے کہ قرض اصل معنی میں بیع ہے، کیونکہ آپ مال دیتے ہیں اور لیتے بھی ہیں، اور لغوی اعتبار سے اس میں ایک چیز کا دوسری چیز سے تبادلہ لازم آتا ہے۔

لفظ "بیع" ملکیت پر بھی دلالت کرتا ہے، اس لئے کہ بیع کرنا مطلب ہے کسی چیز پر اختیار حاصل کرنا۔

اور یہ لفظ بیع و شراء دونوں پر منطبق ہوتا ہے، یہ اضداد میں سے ہے، اصل پر بھی دلالت کرتا ہے، اور اس کی ضد پر بھی۔

اس لفظ کے "اشتقاق" میں اختلاف ہے، اکثر فقہاء نے اس کو "الباعۃ" سے مشتق قرار دیا ہے، اس لئے ان دونوں میں سے ہر ایک اپنی باع کو خرید و فروخت کے لئے دراز کرتا ہے، تو اس کا اصل معنی ہے کہ ان میں سے ہر ایک بیع کی اتمام کے لئے مصافحہ کرتے ہیں، دونوں اپنے اپنے باع کو دراز کرنے کی وجہ سے یہ عمل بیع کہلایا ہے۔

صحیح یہ ہے کہ یہ "باع" سے ہے، یعنی ملکیت حاصل کرلینا، اس لئے کہ بیع کا لازمی نتیجہ ملکیت ہی ہے، اور یہی صحیح ہے، گو کہ اکثر فقہاء نے پہلی بات کہی ہے تاہم علماء اللغۃ کے ہاں یہی بات درست اور صحیح ہے۔

بیع کا اصطلاحی معنی:

اہل علم کا ہاں "بیع" کا اصطلاحی معنی میں کافی تعریفات کی گئی ہیں، ان سب میں اصح اور ادق تعریف یہ ہے: مبادلة مال ولو في الذمة، أو منفعة مباحة، بمثل أحدهما، على التأبيد، غير ربا ولا قرض.

مبادلة: یہ مفاعلہ کے وزن پر ہے، طرفین کے مابین بطور تبادلہ کے معاملہ ہے، کسی دو یا دو سے زائد کے مابین تعویضاعقد ہوتا ہے، یہ لفظ ہی اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ یہ طرفین کے درمیان ہو۔

ABM PrintTime

مبادلة مال: لفظ "مال" سے مراد، اہل علم کے ہاں یہ ہے کہ ہر وہ شے جس سے انتفاع کیا جاتا ہو، جیسے روپے پیسے، کپڑے، کتابیں وغیرہ۔ آج ہمارے پاس مال سے مراد صرف روپے پیسے ہی لئے جاتے ہیں، اہل علم کے ہاں ایسا نہیں ہے، اس مبادلہ میں اہل علم کی اصطلاح کے مطابق ہر چیز داخل ہے جس سے انتفاع ہو۔

مبادلة مال ولو في الذمة: اس اضافی لفظ سے مقصود یہ ہے کہ اس سے فروخت کی جانے والی شيء کی تحدید ہے، اس طرح سے کہ بائع کا یہ کہنا کہ میں "اس" کتاب کو فروخت کر رہا ہوں، تو قریبی اور عینی شے کی طرف اشارہ اس بات دلیل ہے کہ شے محدد ہے، اس میں کسی طرح اشتباہ نہیں ہے۔

ولو في الذمة: اس سے مقصود یہ ہے کہ اس میں مال محدد نہیں ہوتا ہے، البتہ اس کا وصف معروف ہونے کی وجہ سے اس کی جہالت رفع ہو جاتی ہے، جیسے بیع السلم کے معاملے میں ہوتا ہے، کیونکہ اس میں مبیع موجود نہیں ہوتی ہے، اور شے محدود تو نہیں ہوتی ہے، البتہ وصف معین ہو جاتا ہے، کلو، وزن، اور وقت سب معلوم رہتا ہے۔

اسی طرح کسی شے کا جس کا وصف بیان کیا جا چکا ہے - ایک اہم قاعدہ اس سے متعلق آگے آئے گا- جیسے کہا جاتا ہے: میں آپ کو میرا گھر فروخت کرنے والا ہوں، جو فلاں شہر میں واقع ہے، اس کی کشادگی، اس میں موجود کمرے، اور اس کی بناوٹ، اور اس کے دیگر لوازمات ایسے اور ایسے ہیں، جس سے اس کی جہالت رفع ہو جاتی ہے۔

تو اس شے اور مبیع کی پوری توصیف کی گئی ہے، لیکن مبیع موجود نہیں ہے، اسی شکل کو "الذمۃ" کہا جاتا ہے۔

کبھی اصل مبیع پر گفتگو نہیں ہوتی ہے، بلکہ اس کی قیمت پر بات ہوتی ہے، یعنی کسی کتاب کو ۱۰۰ روپے میں فروخت کی بات ہو تو کتاب پر بات نہیں ہوتی بلکہ ۱۰۰ روپے پر کلام ہے، اور ۱۰۰ روپے ایک معروف شے ہے، تو اس میں عین یعنی مبیع پر نہیں بلکہ اس کی قیمت کا معاملہ رکھا جاتا ہے۔

مذکورہ باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ مبیع کبھی محدد ہوتی ہے، اور کبھی موصوفا معلوم رہتی ہے اور کبھی اس کی قیمت کا اندازہ لگا لیا جاتا ہے، یہاں آخر الذکر دونوں کو "الذمۃ" کہا جاتا ہے۔

مبادلة مال ولو في الذمة، أو منفعة مباحة: یعنی بیع میں کبھی مجرد انتفاعات تبادلہ ہوتا ہے جس میں اصلاً مبیع نہیں ہوتی، کبھی بیع ہی ہوتی ہے، اس کی توضیح کے لئے میں آپ کو ایک مثال کے ذریعے سمجھاتا ہوں: ایک شخص کے پاس اس کا اپنا گھر ہے لیکن وہ طریق عامہ میں واقع نہیں ہے، اور اگر اس کو طریق عامہ تک پہنچنا ہو تو خاصہ وقت درکار ہوتا ہے، اس طویل مسافت سے بچنے کے لئے یہ اپنے پڑوسی

ABM Print Time

جس کا گھر اس کے گھر کے پیچھے ہی ہو تو وہ اپنے اس پڑوسی سے بس اپنے گھر تک پہنچنے کے لئے مرور کی حد تک شراء کرتا ہے، اس طرح وہ اپنے اس پڑوسی سے گذر گاہ نہیں خرید تا ہے بلکہ اس پر سے مرور کا خریدار ہوتا ہے۔

یعنی اس میں مدت کی تحدید نہیں ہوتی ہے، تعریف میں موجود اس قید سے ہم اجارہ کی بحث سے نکل جاتے ہیں، اس لئے کہ اگر وہ مرور کو ایک مدت کے لئے لیتا ہے تو وہ اجارہ ہو جائے گا۔ لیکن اگر وہ اس مرور کو تابید الیتا ہے تو وہ عقار یعنی زمینی طور سے وہ اپنے طور سے قائم ہے تو وہ بیع کہلائے گی۔ بالآخر یہ جاننا چاہیے کہ اس میں اور اجارہ میں فرق کیا ہے؟ اس لئے کہ اس عقد میں کوئی حد متعین نہیں ہے۔

اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ: ایک شخص ہے اس کے پاس خالی زمین ہے جس کا وہ مالک ہے، یا کرایہ پر زمین لیا ہے جس سے وہ فائدہ اٹھاتا ہے کیونکہ وہ زمین ایک مناسب جگہ میں ہوتی ہے، ایسے میں ایک شخص آتا ہے اور اس سے اس زمین کو لینا چاہتا ہے تاکہ اس سے وہ تجارت کر سکے، کیونکہ وہ مناسب مقام پر ہے، تو جب یہ شخص اس کو فروخت کرتا ہے تاکہ وہ اس سے فائدہ حاصل کرے تو اسی کو "خلو" کہتے ہیں، یعنی کسی کا اپنی زمین خالی کر کے کسی کو انتفاع کی خاطر دے دینا، مزید تفصیل یہ ہے کہ اس نے کسی اور کی زمین کو کسی غیر کے لئے انتفاع پر بیچ دیتا ہے۔ وہ حقیقت میں مستاجر تھا لیکن اس کے باوجود اس نے اس عقار کو انتفاع پر فروخت کر دیا ہے اسی کو بیع کہتے ہیں۔ راجح قول یہ ہے کہ یہ کچھ شروط کی بنا پر اہل علم کے نزدیک صحیح ہے، ان شاء اللہ قواعد کے ضمن میں اس پر آئندہ گفتگو ہوگی۔

مبادلة مال، أو منفعة مباحة، بمثل أحدهما: بیع کبھی اس طرح سے بھی ہوتی ہے:

مال سے مال کا تبادلہ۔

کبھی مباح منفعت پر مال کا تبادلہ، اور کبھی اس کا عکس۔

کبھی مباح منفعت کا اسی کے ہم جنس سے تبادلہ۔

یہ سب بیع کی مختلف صورتیں ہیں۔

علی التأبید: تابید کا معنی کیا ہے؟ اس میں دراصل مدت کی تحدید نہیں ہوتی ہے، ایسا کیوں؟ کہتے ہیں کہ: ایسا اس لئے ہے کہ اس میں اجارہ سے دامن بچانا مقصود ہوتا ہے، اس لئے مذکورہ گذرا ہوا معنی اجارہ پر ہی منطبق ہوتا ہے، اسی لئے "تابید" کی قید لگائی گئی تاکہ اجارہ کے حکم سے اس کو علاحدہ رکھا جائے۔

غیر ربا: اگر ہم گذرے ہوئے معنی پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ربوی معنی اس میں موجود ہے، تابید پر مال سے مال کا تبادلہ ہی ربا کہلاتا ہے، تو یہ معنی اس پر منطبق ہوتا ہے، اور ربا کسی طور سے بھی بیع نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالی نے ربا کو بیع کی ضد بتلایا ہے: ﴿وأحلَّ اللَّه

الْبيعَ وحرَّمَ الربا﴾(البقرة: 275)۔تو ربا صرف حرام بیع ہے ایسا نہیں بلکہ وہ اصلا ہی بیع نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ تعالی ربا کو بیع کی ضد کہاہے، بیع کو ایک جہت میں تو ربا کو دوسری جہت میں پیش کیا گیاہے۔

یوں کسی طور سے بھی ہم کو چاہیے کہ ہم ربا کو بیع کے معنی سے خارج کریں، اہل علم کے اس پر اقوال موجود ہیں۔

ولا قرض: کہتے ہیں کہ قرض بھی مذکورہ سابقہ معنی پر ہی منطبق ہوتاہے، لیکن اس میں منفعت اصل مقصود نہیں ہوتی ہے، اور نہ ہی معاوضہ مقصود ہوتاہے، البتہ اس میں دوسرے پر احسان اور رفق مقصود ہوتاہے، تو اس طرح بیع پر اس کا بھی انطباق نہیں ہوتاہے تو اس کا بھی اس سے اخراج کردئے ہیں۔

بیع سے متعلق اہل علم نے یہ تعریف کی ہے، البتہ اس مقدمے کو ختم کرنے سے قبل ہم بیع سے متعلق لازمی صفات کو بتلانا ضروری سمجھتے ہیں، کیونکہ اس کے فہم میں کئی لوگوں کو میں نے خلل محسوس کرتے ہوئے پایاہے حتی کہ بعض طلبہ میں بھی اس طرح کا خلل موجود ہے۔

بیع سے متعلق لازمی صفات پیش نظر ہونی چاہیے تاکہ وہ صحیح معنوں میں بیع کہلائے۔

1)- پہلی بات یہ ہے کہ یہ راس المال کو متضمن نہ ہو۔

2)- یہ ربح اور منفعت کو بھی متضمن نہ ہو۔

3)- منافع کی کوئی مقدار معین اور محدود نہ ہو۔

ألا يضمن رأس المال: یعنی راس المال اس میں کسی طرح کا ضامن نہ ہو، بلکہ اس امر کا امکان ہو کہ اس میں کا کل یہ بعض اس سے جاتا رہے، اور یہ بھی ممکن ہو کہ یہ زائل ہی ہو جائے، ایسے ہو سکتاہے کہ تم خرید و فروخت کرو اور اس میں تمہیں نقصان ہو، جس سے راس المال ہی ختم ہو جائے، اور یہ بھی ہو سکتاہے کہ خوب خوب نفع ہو، اسی کو بیع کہتے ہیں، یعنی جس میں نقصان اور نفع دونوں کی گنجائش ہوتی ہے۔

وألا يضمن الربح: یعنی نفع ہو جائے اس کا احتمال رہتاہے۔

وألا يحدد الربح بمقدار معين: اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا نہیں کہا جائے گا کہ تمہارے لئے ماہانہ ایک ہزار ریال ہوں گے، مثال کے طور پر عصر حاضر میں ہم کچھ لوگوں کو یہ کہتے ہوئے دیکھتے ہیں کہ کوئی کسی سے یہ کہتاہے کہ آپ مجھے ایک ہزار ریال دیں میں آپ کے لئے "سوا" نامی سم کارڈس فروخت کروں گا، اور تمہیں ماہانہ پانچ سو ریال دوں گا۔ اس طرز تعامل کو بیع کہنے میں شرعی نقطہ نظر سے تین علتیں ہیں:

ABM Print Time

پہلی علت یہ ہے کہ اس میں راس المال ضامن ہوتا ہے،جب آپ کو اس میں نفع ہے ہی تو راس المال کسی طور سے بھی ختم نہیں ہو گا۔ایسی صورت میں یہ ربا ہو گا بیع نہیں ہو گی۔

دوسری علت یہ ہے کہ اس میں ماہانہ پانچ سو ریال طئے کر کے نفع لازمی کر دیا گیا ہے۔

تیسری علت یہ ہے کہ اس میں نفع محدود کر دیا گیا ہے،یعنی پانچ سو ریال کا طئے کرنا۔اس میں اس طرح کا عقد جائز نہیں ہے،اور نہ ہی اس کو بیع کہیں گے۔

لیکن اگر فرض کر لیا جائے کہ یہ طرز تعامل کسی شہر میں عادۃ ایسے ہی رائج ہے،کہ سامان تجارت کی مخصوص نوع میں کسی طرح کا کوئی نقصان نہیں ہوتا ہے،اور تجربہ اس پر شاہد ہے کہ اس میں ماہانہ ایک ہزار ریال نفع اندوز کئے جاتے ہیں،لیکن اس پر عقد نہیں ہوتا ہے اس کو کچھ نقصان ہونے والا نہیں ہے۔

مثلا میں آپ سے کہوں کہ بھائی میرے شہر میں کھجوریں ہیں اور اس میں کسی طرح کا کوئی نقصان نہیں ہے،اس میں محض نفع ہی ہے خسارہ کا کوئی عنصر اس میں نہیں ہے،اور بازار سے متعلق ہماری معلومات کے مطابق اگر تم ایک ہزار ریال کی خریداری کرو گے تو تم پانچ سو ریال کے فائدہ میں رہو گے،تو آپ مجھے ایک ہزار ریال دیں میں آپ کے لئے تجارت کروں گا،اس میں عقد نہ ہونے تک کے معاملے میں کوئی شرعی تحذیر نہیں ہے،اس لئے کہ عقد کے اتمام اور عملی طور سے انجام دینے سے متعلق خبر دینے میں کافی فرق ہے،تو تعاقد غلط ہے،البتہ مجرد اس کی خبر میں شرعا کوئی حرج نہیں ہے۔

ABM Print Time

پہلا قاعدہ

الأصل في البيوع الإباحة

ABM Print Time

مذکورہ دو مقدموں کو ذکر کرنے کے بعد اب ہم بیوع سے متعلق قواعد کا آغاز کریں گے۔

فقہاء نے بیوع سے متعلق جو پہلا قاعدہ بتلایا ہے، وہ ہے:

" الأصل في البيوع الإباحة ".

یہ اس موضوع کا نہایت اہم قاعدہ ہے، آپ حضرات اس قاعدے میں غور کرے ہوں گے کہ یہ کلمہ "الأصل" سے شروع کیا گیا ہے۔ بہت سارے قواعد میں آپ اس کلمہ کو دیکھتے ہیں، جیسے: "الأصل براءة الذمة"اور" الأصل في الأمور العارضة العدم ، کیااس کے ذکر میں کوئی فائدہ ہے؟ یا یہ محض ایک اتفاقی امر ہے؟یعنی اس کلمہ کے وجود سے کوئی فقہی فائدہ بیان کرنا مقصود ہوتا ہے، یا صرف ایک صیاغہ ہے جو ذکر کر دیا جاتا ہے؟ ہم اس کے ذکر میں دو فائدے بیان کریں گے:

پہلا فائدہ: یہ بتلانا مقصود ہوتا ہے کہ اس موضوع سے متعلق جو قاعدہ مستمرہ ہے جس پر ایک مسلم قائم رہنا ہے وہ وہی ہے جو اس قاعدہ میں مذکور ہے۔ جیسے ہم بیوع کے بیان میں یہ قاعدہ "الأصل في البيوع الإباحة" پیش کرتے ہیں تو یہ بتلانا مقصود ہے کہ ایک مسلم کو چاہیے کہ وہ بیوع میں اباحت کو اصل سمجھے۔

پھر اس فائدہ سے کئی فوائد مستنبط ہوتے ہیں، ایک فائدہ یہ ہے کہ اس قاعدہ کی رو سے ایک مسلم کو چاہیے کہ وہ اس پر توقف نہ کرے بلکہ اس پر عمل پیرا رہے۔

دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس قاعدہ کے ہوتے ہوئے دلیل کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا، بلکہ جو قاعدہ کے خلاف دعوی کرے گا اس سے دلیل مانگی جائے گی۔

تیسرا فائدہ یہ ہے کہ یہ قاعدہ ایک میزان اور معیار ہے، اسی سے مسائل معلوم کئے جاتے ہیں، جو اس قاعدے کے موافق ہو گا وہ قبول ہو گا، اور جو اس کے بالمقابل ہو گا تو اس دلیل پر غور کریں گے، ورنہ اصل قاعدہ کی رو سے مسئلہ کی تحلیل ہو گی۔

یعنی جب ہم اس قاعدہ "الأصل في البيوع الإباحة" کی رو سے مسائل البیوع پر مباح ہونے کو اصل سمجھیں گے، کوئی بھی بیع ہو ہم کہیں گے کہ یہ مباح ہے، یہ بھی مباح ہے۔

ABM PrintTime

یہاں تک کہ کوئی فقیہ یہ کہے کہ یہ بیع حرام ہے، ایسی صورت میں ہم اس کے حرام ہونے سے متعلق دلائل پر غور کریں گے، اگر اس کے حرام ہونے سے متعلق دلیل ہوتی ہے تو ہم اس کو لے لیں گے، اور اگر دلیل صحیح نہیں ہے تو ہم اس کو اصل کی طرف لوٹائیں گے کہ یہ مباح ہے۔ گویا یہ قاعدہ مسائل شتی کے لئے ایک میزان کی حیثیت رکھتا ہے۔

چوتھا فائدہ: اس اصل قاعدہ کی جانکاری کی وجہ یہ بہت سارے جزئی مسائل کے یاد کرنے سے بے نیاز کر دیتی ہے۔

جب آپ اس قاعدے سے واقف ہو جائیں تو جزئیات کی حاجت نہیں رہ جاتی ہے، آپ اس سے واقف ہیں کہ "الأصل في البيوع الإباحة" تو ہر بیع سے متعلق حکم جاننے کی ضرورت نہیں ہے، آپ کو تو بس اس سے مخالف دلیل کو یاد کرنے کی ضرورت ہے۔

اسی لئے جب فقہاء کی زبانی یہ سنیں "الأصل" تو مسئلے کی جزئیات کے پیچھے پڑ کر اپنے آپ کو نہ تھکائیں، بلکہ اس کے مخالف دلائل کو یاد کرنے کی کوشش کریں، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جب پوچھا گیا کہ ایک محرم کو کیا پہننا چاہیے؟ تو کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سوال کا جواب ارشاد فرمایا؟ نہیں، کیونکہ یہی اصل ہے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں یہ ارشاد فرمایا کہ کیا نہیں پہننا چاہیے۔ کیونکہ یہ اصل کے خلاف ہے، رہا اس کا پہننا یہ اصل ہے اس لئے کہ وہ حسب ضرورت جو چاہے پہنے، اس کا یاد رکھنا کوئی ضروری نہیں ہے، یاد تو اس چیز کو رکھنا چاہیے جو اصل کے خلاف ہے، کہ کیا نہیں پہننا چاہیے؟

بہر کیف طالب کے لئے یہ ضروری ہے کہ فقہاء کی زبانی "الأصل" معلوم کر لینے کے بعد اصل کے تحت آنے والے مسائل کو یاد کرنے میں اپنے وقت کو ضائع نہ کرے، بلکہ علمی اور عملی طور سے اس کے مخالف مسائل کو یاد کرنے کی کوشش کرے۔

قاعدے میں مذکور "الأصل" کا یہ پہلا فائدہ ہے، اور اس سے متفرع ہونے والے کچھ دیگر فوائد تھے۔

<u>دوسرا فائدہ:</u> قواعد فقہیہ میں موجود "الأصل" اس قید کا ایک دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس میں یہ باریکی ہے کہ یہ قاعدہ مطردہ نہیں ہے بلکہ اس کو چھوڑا بھی جا سکتا ہے۔

جب ہم یہ کہتے ہیں "الأصل في البيوع الإباحة" تو ہم آپ کو یہ شعور دینا چاہتے ہیں کہ ہر بیع مباح نہیں ہے بلکہ کچھ بیع حرام بھی ہے، یوں اس قاعدے "الأصل في البيوع الإباحة" کے ذریعے تنبیہ مقصود ہے کہ کچھ بیع حرام بھی ہوتی ہیں، جنہیں اصل پر نہیں تولا جا سکتا ہے۔

یہ معلوم کر لینے کے بعد اب ہم اس قاعدے کی تفصیل بیان کریں گے۔

ABM Print Time

لغت میں " اصل " کا معنی: اصل کہتے ہیں کسی بھی چیز کا سب سے نچلا حصہ اوراس پر جو چیز بنتی ہے، اور پھر اس سے جو اشیاء متفرع ہوتے ہیں۔

جب ہم کہتے ہیں: عمارت کی تاسیس جو کہ اس کی اصل ہوتی ہے، جسے آج ہم قواعد یعنی بنیاد کہتے ہیں، اس لئے کہ اسی پر عمارت قائم ہوتی ہے، اور ہمارا یہ کہنا: والد ولد کے لئے اصل کی حیثیت رکھتا ہے، اس لئے کہ ولد والد سے ہی متفرع ہوتا ہے، تو عربی لغت میں اسی کو اصل کہتے ہیں۔

اب رہا مسئلہ " اصل " کا اہل علم کے ہاں کیا معنی ہے؟ تو ان کے ہاں اس کے کئی ایک معانی لئے جاتے ہیں، ان میں سے ایک ہے " راجح " کے معنی میں، جیسے کہا جاتا ہے: "الأصل في الكلام الحقيقة" یعنی کلام میں راجح قول یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے حقیقی معنی میں ہوگا۔ اور یہ قول ان کے ہاں ہے جو کلام کو حقیقی اور مجازی میں تقسیم کرتے ہیں۔

یعنی جب کلام کے معنی لینے میں تعارض ہو جائے تو اس میں راجح کے طور پر حقیقی معنی کو لیا جائے گا۔

اس کی توضیح کے لئے ہم آپ کو ایک مثال پیش کرتے ہیں: مثلا ایک شخص یہ کہتا ہے کہ: میں اپنے مال میں سے ایک ثلث فلاں صاحب کی اولاد کے لئے وصیت کرتا ہوں، تو اس شخص سے کہا جاتا ہے کہ فلاں صاحب کی اولاد ہے اور اس کی اولاد بھی ہے اور اس کے اولاد کی اولاد بھی ہیں، تو یہ معنی یہ ہوگا کہ اس کی صلبی اولاد حقیقی ہے اور اس کی اولاد کی اولاد مجازی ہے۔ اس لئے کہ کلام میں راجح قول یہ ہے کہ وہ حقیقی معنی میں ہوگا۔

" اصل " کا اہل علم کے ہاں ایک اور معنی " دلیل " کا ہے، جیسے ان یہ کہنا: اس مسئلہ میں اصل کتاب وسنت ہیں، یعنی مسئلہ کی وضاحت میں بطور اصل کے دلیل پیش کی جاتی ہے، کہ کتاب اللہ میں ایسا ہے اور سنت رسول میں اس کی یہ وضاحت ہے۔

" اصل " کا ایک اور معنی "الأمر المستصحب" کا لیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اصل اور طارئ میں تعارض، یا اصل اور ظاہر میں تعارض۔

میں آپ کو اس کی ایک مثال دیتا ہوں، وہ یہ کہ "الأصل في الأراضي الطهارة" لیکن وہ زمین اگر کسی ایسی جگہ میں واقع ہے جس میں نجاست بھری پڑی ہے، تو یہاں نجاست غالب ہے اور اصل طہارت ہے، تو ایسی مناسبت پر کہا جاتا ہے اصل اور ظاہر میں تعارض ہے۔ " اصل ": "الأمر المستصحب " ہے۔ اور " ظاہر ": کثرت نجاست کی وجہ سے فی الحال جو ظن غالب ہے وہ " ظاہر " ہے۔ یہ ایک طویل مسئلہ ہے جس پر حافظ ابن رجب رحمہ اللہ نے کافی طوالت سے کام لیا ہے، اور قواعد سے متعلق مسائل پر کلام کرنے میں حافظ ابن رجب رحمہ اللہ سب سے آگے ہیں۔

اہل علم کے ہاں "الأصل" کا اطلاق "مقيس عليه" پر بھی ہوتا ہے۔ ارکان قیاس میں " الاصل " کا مطلب ہے جس پر قیاس کیا جاتا ہے۔

ABM Print Time

اسی طرح اہل علم کے ہاں "الأصل" کا اطلاق قاعدہ مستمرہ پر بھی ہوتا ہے، اور فی الحال یہاں یہی مراد ہے۔

توان حضرات کا یہ کہنا: "الأصل في البيوع الإباحة" یعنی بیوع میں قاعدہ مستمرہ اباحت ہے۔

مطلب ہے کہ اہل علم جب مذکورہ قاعدہ بیان کرتے ہیں تو یہ قاعدہ مستمرہ ہے، اس میں کسی طرح کا تغیر نہیں ہو گا جب تک کہ دلیل نہ ہو، مخالف دلیل نہ ہونے کی صورت میں یہ اصل ہے اس میں تغیر نہیں ہو گا۔

"الأصل في البيوع الإباحة" کلمہ "البیوع" کی ہم نے شرح کردی ہے۔

"الإباحة" کا لغوی معنی ہے اطلاق، اذن اور اظہار کے ہیں۔

اطلاق: یعنی ہمارا کہنا کہ میں نے آپ کو میری کار استعمال کے طور پر اجازت ہے۔ یعنی آپ کے لئے میں نے اسے کھول دیا ہے۔ اسی طرح اذن میں بھی یہی بات ہے کہ میں نے میری کتاب آپ کو پڑھنے کی اجازت دیا ہوں، اور اظہار کا معنی اس طرح سے کہ باح یعنی کسی راز اور چھپی ہوئی شے سے اس کا اظہار ہے، اور اباحت کے معنی میں فی الحال اکثر لوگوں کا یہی رجحان ہے۔ صرف اس کے چھپے رہنے سے متعلق ہی نہیں بلکہ اس کے اور اس کے علاوہ کی اشیاء کے اسرار سے متعلق بھی ہے۔

اصطلاحا "الإباحة" کا اہل علم کے نزدیک معنی یہ ہے کہ: کسی کام کے کرنے یا چھوڑنے کی اجازت دینا چاہے نص کی بنیاد پر ہو یا شریعت میں سکوت کی بنیاد پر ہو دونوں معاملات برابر ہیں۔

مثلا نص کی موجودگی میں بھی اباحت ہے: ﴿فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاءِ﴾(ص: 3)۔ یہ اباحت ہے، آیت مذکورہ میں موجود حکم اباحت پر دلالت کر رہا ہے، کیونکہ وہ طیب ﴿ما طَابَ لَكُم﴾ سے مقید ہے۔ تو ایسی صورت میں یہ وجوب دلالت نہیں کرتا۔ تو کرنے یا چھوڑنے سے متعلق منصوص ہے۔

سکوت: یعنی عادت کے قبیل کی ہونے کی وجہ سے شریعت اس کے حکم دینے سے خاموشی اختیار کر لے تو وہ بھی مباح ہے، نہ شریعت اس سے روکتی ہے اور نہ ہی کرنے کا حکم دیتی ہے، یوں یہ مباح کہلاتا ہے۔

بعض اصولی حضرات یہ کہتے ہیں کہ اذن دو طرح کا ہوتا ہے: ١- مباح ٢- عفو

اب یہ معلوم کرنا ہے کہ مباح کیا ہے اور عفو کیا ہے؟

مباح کہتے ہیں ہر اس عمل کو جسے کرنے اور چھوڑنے کے بارے میں برابری ہو، جس میں کرنے سے متعلق نصًا معلوم ہو تو وہ مباح ہے۔

ABM Print Time

العفو: جس میں شریعت کرنے یا نہ کرنے سے متعلق خاموش رہ کر اس کی اجازت دے، یہ اصول ایک حدیث مبارکہ سے لیا گیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «الْحَلَالُ ما أَحَلَّ اللَّهُ في كتَابه»[7] یہ مباح ہے۔«الْحَلَالُ ما أَحَلَّ اللَّهُ في كتَابه، والْحَرام ما حَرَّمَ اللَّهُ في كتابه، وما سَكَتَ عَنْهُ، فَهو عفْو» عملی طور سے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے، لیکن اصولیوں کے ہاں بطور اصطلاح نص پر عمل کرنے کے اعتبار سے فرق ہے، لیکن پھر بھی ہم عملی طور سے دیکھیں تو دونوں چاہے مباح ہو یا عفو ہو دونوں بھی برابری پر شرعا ماذون ہیں۔

مذکورہ تعریف کے پیش نظر اس قاعدہ کا اجمالی معنی یہ ہے کہ: بیوع سے متعلق قاعدہ مستمرہ یہ ہے کہ ایک مسلم اس میں مباح کا خیال رکھے اور معلوم کرے کہ اس میں منع اصل نہیں ہے۔ اور اس میں کسی مسلم کو بیع میں توقف کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، وہ جیسے چاہے بغیر توقف کے بیع وشراء کرے، جب تک کہ اس میں شرعا کوئی مانع نہ ہو، ہاں اگر مانع ہو تو اس بیع کو چھوڑ دے۔ یہی اس قاعدہ کا معنی ہے۔

اب اس کے بعد ہم اس قاعدہ کے دلائل پیش کریں گے۔

قاعدہ کے دلائل اہل علم نے کہاں سے اخذ کئے ہیں؟ کہ "الأصل في البيوع الإباحة"۔

اہل علم کلی دلائل سے جزئیات کے لئے استدلال کرتے ہیں۔

قاعدہ کے لئے جزئی دلائل یہ ہیں کہ کتاب وسنت اور اجماع کی رو سے بیع کے جواز پر دلالت ہوتی ہے۔

اس کی توضیح کے لئے ایک مثال یہ ہے کہ اللہ تعالی کا فرمان ہے: ﴿وأَحَلَّ اللَّهُ الْبيع وحرَّم الربا﴾(ص: 275) یہ آیت کریمہ ہر بیع کی حلت پر دلالت کناں ہے جب تک کہ شرعا کوئی مانع نہ ہو، تو ہر بیع حلال ہے ہاں شریعت کسی خاص کو منع کرتی ہے تو وہ حرام ہے، اللہ تعالی کے اس فرمان کے مطابق: ﴿وأَحلَّ اللَّه الْبيع﴾

اسی طرح اللہ تعالی کا یہ فرمان: ﴿إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ﴾(ص: 29)۔ اللہ تعالی نے طرفین کی آپسی رضامندی پر ہر طرح کی بیع کو حلال قرار دیا ہے، بس شرعا کوئی مانع ہو جائے تو وہ حرام ہے۔

---

[7] - سنن الترمذي: كتاب اللباس، باب ما جاء في لبس الفراء. برقم: 1726. وسنن ابن ماجه: كتاب الأطعمة، باب أكل الجبن والسمن. برقم: 3367. كلاهما عن سلمان الفارسي رضي الله عنه، حسنه الشيخ الألباني رحمه الله. البتہ اوپر کے الفاظ امام بیہقی رحمہ اللہ کی "السنن الکبری" سے لئے گئے ہیں جسے شیخ البانی رحمہ اللہ نے حسن کہا ہے۔

ABM PrintTime

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول بھی اسی معنی میں ہے: «إِنَّمَا الْبَيْعُ عَنْ تَرَاضٍ»[8]۔اس حدیث کو ابن حبان اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے، اور اہل علم کی ایک جماعت نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر طرح کی بیع کو جو طرفین کے مابین رضامندی سے واقع ہوئی ہے مباح قرار دیا جب تک کہ شرعا کوئی ممانعت نہ ہو۔

اسی طرح دسیوں احادیث میں یہ خبر ملتی ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع وشراء کی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیع میں اصل اباحت ہے۔

عہد نبوی میں صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین بھی بغیر توقف کے بیع وشراء کرتے تھے، تو ان کے علم میں یہ بات تھی کہ بیع میں اصل اباحت ہے۔

اور صحابہ کے طرز تعامل سے یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر طرح کی بیع میں صحت معلوم کرنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع فرماتے ہوں بلکہ جب انہیں کسی طرح کا شبہ ہوتا تو اس کے معلوم کرنے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کرتے۔ یہ بھی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ بیع میں اصل اباحت ہے۔

اسی لئے اس پر اہل علم کا اجماع بھی منعقد ہے، جیسے ابن قدامہ، نووی، اور غزالی رحمہم اللہ نے بیع سے متعلق دیگر قطعی مسائل کی طرح اس کو بھی اسی طرح کا اجماع بیان کیا ہے، یعنی جس میں کسی طرح کا نزاع نہیں ہے اور نہ نزاع متصور ہی ہے، اس امر میں نزاع کا متلاشی مجنون ہے، اصولیوں کے ہاں اجماع گویا قطعی طور سے دلیل کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس قاعدہ سے متعلق ادلہ ءکلیہ یہ ہیں کہ بیع نفع بخش اشیاء میں سے ہے، اور اہل علم کے نزدیک یہ بات مسلم ہے کہ جو شے نفع بخش ہو وہ مباح، یہی جمہور اہل علم کا قول ہے، بلکہ ابن رجب رحمہ اللہ نے دیگر اہل علم سے اس اجماع نقل کیا ہے، اور ابن تیمیہ رحمہ اللہ اس پر سلف کا اتفاق بتلایا ہے، کہ نفع بخش اشیاء میں اصل مباح ہے، اور یہی حقیقت بھی ہے۔

رب العلمین کا یہ فرمان﴿هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعاً﴾(البقرة: 29) بھی اس پر دلالت کرتا ہے، اس آیت کریمہ میں اللہ تعالی نے یہ خبر دی ہے کہ اس نے زمین میں جو کچھ ہے وہ سب بنی آدم کے لئے پیدا کیا ہے، اور اس پر لام کا اضافہ ہوا ہے، وہ لام ملکیت اور استحقاق پر دلالت کرتا ہے، اور یہ اس موقع پر کہا گیا ہے جس میں امتنان مقصود ہو اور یہ اسی وقت پورا ہوگا جب وہ جائز ہو، اور بیع اس میں داخل ہے۔

---

[8] - من حديث أبي سعيد الخدري رضي الله عنه، وصححه العلامة الألباني رحمه الله في " الإرواء " وغيره.

ABM PrintTime

اسی طرح اس آیت کریمہ ﴿قُلْ أُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبَاتُ﴾ (المائدة: 4) سے بھی استدلال کیا گیا ہے، یہاں طیبات سے مراد مباحات نہیں ہے، کیونکہ مباح سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، یہاں طیبات سے ہر طرح کی نافع شے مراد ہے، اور طیبات میں اصل مباح ہی ہے، جب تک کہ شریعت اس سے منع نہ کرے، اور بیع طیبات میں سے ہے، نفع بخش ہے اسی لئے اس اصل عظیم میں یہ بھی داخل ہے۔

انہیں دلائل میں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث مبارکہ بھی ہے: «إِنَّ أَعْظَمَ الْمُسْلِمِينَ جرمًا مَنْ سَأَلَ عَنْ شَيْءٍ لَمْ يُحَرَّمْ فَحُرِّمَ مِنْ أَجْلِ مَسْأَلَتِهِ»[9] یہ حدیث صحیح بخاری میں موجود ہے۔

تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث مبارکہ میں ان اشیاء کو مباح قرار دیا ہے جس میں نص وارد نہ ہو، کیونکہ آپ نے فرمایا: «إِنَّ أَعْظَمَ الْمُسْلِمِينَ جرمًا مَنْ سَأَلَ عَنْ شَيْءٍ لَمْ يُحَرَّمْ» یعنی جس پر خاموشی اختیار کی گئی ہو، «فَحُرِّمَ مِنْ أَجْلِ مَسْأَلَتِهِ» یعنی اس پر سوال نہ کیا جاتا تو اس کی حرمت نہ بیان کی جاتی، یہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اصل مباح ہے۔

اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ یہ عادات میں سے ہے، اور اہل علم کے ہاں یہ بھی طئے شدہ امر ہے کہ عادات میں اصل مباح ہے، شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس پر سلف کا اتفاق نقل کیا ہے، البتہ اس سلسلے میں لوگوں کے دو طرح کے تصرفات ہیں:

۱-عبادات ۲-عادات

عبادات یہ ہیں کہ جن سے آخرت آباد ہو جائے، اسی کو عبادت کہتے ہیں، یعنی ان عبادات سے مقصود اعظم ثواب ہے، اور اہل علم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ عبادات میں اصل حظر یعنی منع اور توقف ہے۔ کوئی عبادت اس وقت تک مشروع نہیں ہو سکتی جب تک کہ اللہ تعالی یا اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس کا حکم بیان فرمادے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «مَنْ عَمِلَ عَمَلًا لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ»[10] اور آپ نے یہ بھی فرمایا: «مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هَذَا مَا لَيْسَ فِيهِ فَهُوَ رَدٌّ»[11] سلف میں صحابہ اور تابعین کا اس پر اتفاق ہے۔

دوسری قسم عادات ہے، جس سے اصل مقصود دنیوی زندگی کو آباد کرنا ہوتا ہے۔

---

[9] - أخرجه البخاري: كتاب الاعتصام بالكتاب والسنة، باب ما يكره من كثرة السؤال وتكلف ما لا يعنيه. من حديث سعد بن أبي وقاص رضي الله عنه.

[10] - صحيح مسلم: كتاب الأقضية، باب نقض الأحكام الباطلة ورد محدثات الأمور. وانفرد مسلم وعلقه البخاري.

[11] - متفق عليه من حديث عائشة رضي الله عنها.

ABM PrintTime

دنیوی زندگی آباد کرنے میں ایک چیز بیع ہے،لوگ خرید وفروخت کرتے ہیں جس سے مال کمانا مقصود ہوتا ہے،تو مال کا حصول عادات میں سے ہے،اور عادات میں اصل وسعت ہے،سابقہ دلائل اس پر دلالت کناں ہیں،اور یہی حکمت کا تقاضا کرتی ہے،عبادات کا تعلق بندے اور اللہ تعالی کے درمیان کا معاملہ ہے اور وہ وہی ہیں جنہیں اللہ تعالی مشروع قرار دے،اور عادات بندے اور بندے کے مابین کا معاملہ ہے تو اس میں توسع ہے،بس شرعی نقطہ ءنظر سے عدم فساد ہو تو لوگوں کی مصلحتوں کا خیال رکھتے ہوئے کسی طرح کا بھی معاملہ کیا جاسکتاہے۔

تو بیع یہ وسعت ہے اسی لئے ہر طرح کی بیع مباح ہے،البتہ بیع الغرر حرام ہے،یہ فساد کو روکنے کے لئے شرعی ضابطہ ہے،اس سے متعلق کچھ مسائل کا آگے تذکرہ آئے گا ان شاءاللہ۔

اس طرح یہ قاعدہ "الأصل في البيوع الإباحة"۔کتاب وسنت اور اجماع کی رو سے جائز ہے۔اور بیع چونکہ نفع بخش اشیاء میں سے ہے تو اس ناحیہ سے بھی اہل علم کے ہاں یہ مسلم ہے کہ: "الأصل في الأشياء النافعة الإباحة"۔اور بیوع عادات میں سے ہے تو اس تعلق بھی یہ قاعدہ ہے کہ: "الأصل في العادات العفو"۔یہ سب امور بیع کے مباح ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔

اس قاعدہ سے یہ چیز متفرع ہوتی ہے کہ ایک مسلم جس طرح چاہے بیع وشراء کرتا رہے جب تک کہ شرعا مانع نہ ہو حتی کہ دور حاضر میں متولد ہوئی بیع ہی کیوں نہ ہو جس سے متقدمین واقف نہ تھے تو اس میں بھی بیع وشراء کرے جب تک کہ شریعت سے منع ثابت نہ ہو جائے۔

مثلا شئیرز کی بیع جس کی خرید وفروخت میں لوگ کافی مشغول ہیں،اس کی حقیقت کیا ہے؟اس لئے کہ اس کی حقیقت معلوم کرنے سے ہی اس کا حکم معلوم کیا جاسکتاہے۔تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ کچھ مال کے بالمقابل کمپنی سے کچھ شے کی خریداری کرنا۔یہ دراصل یہ ایک بیع ہے،بیع سے متعلق اہل علم نے جو بات کہی ہے وہ اس پر منطبق ہوتی ہے۔

اسی بنیاد پر ہم کہتے ہیں کہ شئیرز کی بیع اصلا جائز ہے،البتہ کمپنی سے متعلق غور کرنا ضروری ہے،کہ کمپنی فی نفسہ اپنے تئیں کیا حکم رکھتی ہے ،کہ جن اشیاء کی وہ بیع کرتی ہے وہ جائز ہے یا نہیں؟تو ہم کہیں گے کہ- اور میں جو کہنے جا رہا ہوں اس پر متنبہ رہئے گا-:

شئیرز میں سے کچھ ایسے ہیں جن کی بیع وشراء دونوں جائز ہیں۔کچھ کا خریدنا جائز ہے لیکن بیچنا جائز نہیں،اور کچھ میں دونوں جائز نہیں۔

جس میں دونوں صورتیں جائز ہیں وہ ایسی کمپنیاں ہیں جس میں اصول موجود ہوں اور کوئی شرعا مانع نہ ہو،تو شئیرز کی بیع جائز ہے،اور اس میں تفاضل بھی درست ہے،یعنی ایک سو میں خرید کر دو سو میں بیچا جاسکتاہے۔

اور جن شئیرز کی خریداری جائز ہے لیکن بیع جائز نہیں، وہ ایسی کمپنیاں ہیں جس میں شرعا کوئی مانع تو نہیں ہے لیکن اس کے لئے شرعی اصول موجود نہیں ہیں، اس لئے کہ اس میں بس شرعا ایک کمپنی ہے جس میں مال جمع کیا گیا ہے۔

ہم چاہتے ہیں کہ ہم ایک کمپنی قائم کریں اس کے لئے کوئی اصول نہیں ہیں بس اس کو اکتتاب کے لئے چھوڑ دیں، اس طرح کی کمپنی کا اب تک کوئی وجود نہیں ہے، تو بطریق اکتتاب اس طرح کی شئیرز کی خریداری کی جاسکتی ہے، اس کی خریداری اس لئے جائز ہے کہ یہ کمپنی سے خریدی جارہی ہے، اور اس طرح کی شئیرز کی خرید و فروخت میں تفاضل جائز نہیں، کیونکہ یہ ہنوز مال ہی ہے، ابھی تک بھی ایک پلان ہی ہے جس کے لئے مال جمع کیا جارہاہے، اگر آپ اس میں تفاضل کو روا رکھیں گے تو مال کو مال سے تفاضل پر تبادلہ لازم آئے گا، اور یہ جائز نہیں ہے۔ لیکن اس میں اکتتاب کی قیمت پر بیع درست ہے، اس حالت میں اگر پچاس ریال پر اکتتاب کرلیں پھر اسی قیمت پر پچاس ریال کی زائد رقم سے اس کو بیچ دیں تو یہ جائز ہے، اس لئے کہ اس میں مال سے مال کے مساویانہ انداز سے تقابض ہے، تو یہ مال سے مال کی بیع ہے ایک شے کی اسی شے سے بیع پر جو شروط ہیں وہ اس پر بھی لاگو ہوں گی۔

جن شئیرز سے متعلق ہم نے یہ کہاہے کہ اس میں بیع جائز نہیں صرف شراء ہی جائز ہے، تو ہماری مراد اس میں تفاضل کا وجود ہے۔

اب رہیں وہ شئیرز جن کی نہ بیع جائز ہے اور نہ شراء جائز ہے۔ تو ایسی کمپنیاں ہیں جن میں موانع کا ہمیں علم ہو جائے، تو ایسی کمپنیوں سے کسی مسلم کو بیع و شراء روا رکھنا جائز نہیں ہے۔ اسی طرح ایسی کمپنیاں جو بیڑی سگریٹ فروخت کرتی ہیں، گانے بجانے کے آلات اور سیڈیس فروخت کرتی ہیں، سودی کاروبار کرنے والی کمپنیاں، اور وہ کمپنیاں جو لوگوں کو آلات سماع غنا فراہم کرتی ہیں، کچھ ایسے ارقام اور نمبرات دیتے ہیں جن پر اپلائی کرنے سے گانے اپلوڈ ہو جاتے ہیں، یا گانے والیوں سے متلذذ ہونے کے مواقع فراہم کئے جاتے ہیں، تو اس طرح کی کمپنیاں چاہے ضرر کم ہو یا زیادہ کسی طور سے بھی ان سے بیع و شراء جائز نہیں ہے، کیونکہ اس میں محرم طریق پر اشتراک ہو رہاہے جو کہ حرام ہے۔

اسی لئے اہل علم نے کمپنیوں کی تین قسمیں کی ہیں:

۱- وہ کمپنیاں جو اپنے اصول وضوابط اور معاملات میں شرعی نقطہء نظر سے صاف ہوں۔

۲- جو امور حرام میں ملوث ہوں۔

۳- اور وہ کمپنیاں جو اپنے معاملات میں مختلط ہوں۔

ABM PrintTime

ان تینوں قسموں سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے کہ: « إِنَّ الْحَلاَلَ بَيِّنٌ وَإِنَّ الْحَرَامَ بَيِّنٌ وَبَيْنَهُمَا مُشْتَبِهَاتٌ لاَ يَعْلَمُهُنَّ كَثِيرٌ مِنَ النَّاسِ فَمَنِ اتَّقَى الشُّبُهَاتِ اسْتَبْرَأَ لِدِينِهِ وَعِرْضِهِ»[12]

نقیہ سے مراد «إِنَّ الْحَلاَلَ بَيِّنٌ» ہے۔ محرمہ سے مراد «وَإِنَّ الْحَرَامَ بَيِّنٌ» ہے۔ اور مختلطہ سے مراد «مُشْتَبِهَاتٌ» ہے، اس کو حرام نہیں کہا جا سکتا ہے، البتہ یہ نصیحت کی جائے گی کی اس سے ابتعاد ضروری ہے۔

جو بھی بالآخر ان اقسام سے متعلق ضابطہ کیا ہے؟ اس فن کے متخصصین کے ہاں اس ضابطہ سے متعلق بہت ساری باتیں کی گئی ہیں جو کمپنی کے بابت ہیں، اور دلائل شرعیہ کی روشنی میں تحقیقی بات یہ ہے کہ:

تین بنیادی عناصر:

جن کمپنیوں کے معاملات امور حرام سے پاک ہیں، ان سے لین دین مباح ہے، مثلا: غذائیت کی بیع۔ اس کے نظام میں کوئی امر مانع نہیں ہے، تو نصوص النظام سبھی شرعا مباح ہیں۔ اور اس کے ادراتی امور میں بھی ممنوعات کے قبیل سے کچھ داخل نہیں تو دراصل یہ نظام کے تابع ہوتی ہیں، تو انہیں بنیادی امور سے متعلق کمپنیاں ہوں انہیں "النقیہ" کہا جاتا ہے۔ اس طرح کی کمپنیاں برائے نام ہوتی ہیں۔

النقیہ سے مراد وہ کمپنیاں ہیں جو اپنے معاملات میں کسی طور سے بھی حرام سے واسطہ نہیں رکھتی ہیں، نہ اپنے نظام میں نہ اداراتی امور میں۔

المحرمہ: کہتے ہیں وہ کمپنیاں جو اپنے اداراتی امور اور اپنے نظام میں حرام اشیاء میں ملوث ہوں، قطع نظر اس کے کہ امر مانع کم ہو کہ زیادہ، کبھی کمپنیاں امر حرام میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہیں جیسے سودی کاروبار کرنے والی کمپنیاں ہوتی ہیں، یا کچھ مباح امور ہوں اور کچھ امور حرام، جو اپنے کچھ معاملات حرام رکھتے ہیں، جیسے کہ ہم نے اس کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ کچھ کمپنیاں گانے وغیرہ اشیاء کی تسہیل کرتے ہیں۔

تو یہ حرام ہیں، یا اس کے نظام میں فتور ہو اس طرح کہ اس قوانین میں یہ طئے ہو کہ اس میں بینک کی طرف سے قرض دیا جائے گا، اور عصر حاضر میں بینک سے قرض دینا اس بات کو لازم ہے کہ وہ کچھ فائدے کی بنیاد پر ہی دیا جاتا ہے، اگر نظام میں ہی ایسا ہو تو وہ حرام ہے، کم ہو کہ زیادہ اس کا اس کے حرام ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

---

12 - متفق عليه من حديث النعمان بن بشير رضي الله عنهما، واللفظ لمسلم.

شرعی نقطہ ءنظر سے یہ ایک بنیادی غلطی ہے کہ سود کی حرمت بتلانے کے لئے اس کی شرح بیان کی جائے کہ زائد رقم اتنی ہو اور اتنی نہ ہو ،ایک ربوی درہم جو شخص جانتے بوجھتے کھاتا ہو وہ چھتیس مرتبہ زنا کرنے سے زیادہ سخت ہے۔ تو نظام ہی میں اگر یہ بات ہو تو وہ اصولا ہی حرام ہے۔

المختلط: یہاں میں آپ سے یہ امید رکھتا ہوں کہ آپ اس کو پوری باریکی سے سمجھیں گے، کیونکہ بعض حضرات محرمات کو مشتبہات میں داخل کر دیتے ہیں۔ جب شریعت اس کو الگ کرتی ہے۔ اس سے مراد وہ کمپنیاں ہیں جو نہ اپنے معاملات میں حرام ہوتی ہیں اور نہ ہی نظامی امور میں بلکہ اس کے ادارتی امور میں موانع ہوتی ہیں۔ عمل اور نظام صافی ہیں، لیکن ادارتی طور سے یہ بات ہوتی ہے کہ بینک سے قرض دیا جاتا ہے، یہ مختلط ہے اور اس پر مشتبہات کی تعریف صادق آتی ہے۔ اس لئے کہ اس کی اصل مباح ہے، وہ اس کا عمل اور نظام ہے، البتہ اس میں ایک اصل ہے جو کہ مانع ہے اور وہ ہے اس کے ادارتی طور سے قرض دینا۔ اور یہی تشابہ کی تعریف ہے۔ جس میں دو متضاد صورتیں ہوں ایک مباح کی اور دوسری منع کی۔ ایسی صورت میں ہم ابتعاد کی وصیت کرتے ہیں، لیکن اس کے عمل اور نظام کی وجہ سے حقیقی اشتراک کی بنیاد پر حرام نہیں کہیں گے۔ لیکن مسئلہ اقتراض ایک شبہ ڈال دیتا ہے اسی وجہ سے وہ تشابہ ہو جاتا ہے۔ تو ایک مسلم کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اس سے دور رہے اور اس میں کسی طور سے بھی شریک نہ رہے۔

اس قاعدے سے تعلق رکھنے والے امور میں سے ایک "تقسیط" کی بیع بھی ہے۔

بیع التقسیط یہ ہے کہ کوئی سامان خرید تا ہے ایک ایسی قیمت پر جو ایک ساتھ یا مراحل سے مگر موجل ہو، البتہ علی الفور ادا کی جانے والی قیمت سے زیادہ ہوتی ہے۔

ثمن موجل یعنی ایک یا دو سال کا وقت لیا جائے۔ منجم یعنی اس تفصیل کے ساتھ کہ ہر ماہ میں اتنی قیمت ادا کی جائے گی، غیر منجم یعنی دو سال بعد پوری رقم ایک ساتھ لوٹا دی جائے گی، اور تعریف میں آخری بات یہ کہ اگر علی الفور ادا کر دی جائے تو اس میں اشکال ہی نہیں رہ جاتا۔

بیع التقسیط جائز ہے، اس لئے اس میں بیع کی ساری صورتیں موجود ہیں، اور یہ قاعدہ ہے کہ: "الأصل في البيوع الإباحة"۔

اس کو جو حرام کہے اس پر ضروری ہے کہ وہ دلیل لائے، اور اس پر کوئی دلیل نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو بیع میں بیع کرنے سے منع فرمایا ہے[13]۔ سلف نے اس کی تفسیر اس طرح کی ہے کہ کسی سامان کی دو الگ الگ قیمتیں لگائی جائیں اور اس پر بیع منعقد ہو ۔ جیسے کسی کا کہنا: میں اس پانی کو اگر اب لیں تو ایک ریال میں دوں گا، اور کل لیں تو دو ریال میں۔ تو گویا کہ اس میں قیمت کی تحدید نہیں ہوئی ہے اس لئے کہ اس میں دو بیع ہیں۔ لیکن بیع التقسیط میں ایسا نہیں ہوتا ہے جب کہ اس میں بھی دو قیمتیں ہوتی ہیں، لیکن بیک وقت

---

[13] - امام ترمذی اور امام نسائی رحمہا اللہ نے اس حدیث کو از طریق ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے لائے ہیں، اور شیخ البانی رحمہ اللہ نے صحیح کہا ہے۔

ABM PrintTime

دونوں پر بیع نہیں ہوتی ہے۔ دراصل اس بیع کی مشابھت اس طرز سے ہے جس میں کوئی شخص دوران شراء تخفیض کراتے رہتاہے، کہ اور بائع بھی ایک قیمت سے دوسری قیمت پر تنازلی اختیار کرلیتاہے۔ تو اس میں بھی یہی معاملہ ہوتا ہے کہ اب لیں گے تو یہ قیمت اور کچھ عرصہ بعد لوٹائیں گے تو یہ قیمت۔ تو اس میں دو میں سے ایک قیمت پر بیع ہوتی ہے تو بیع التقسیط صحیح ہے۔

بیع التقسیط صحیح ہے اس شرط پر کہ اس میں مقصود سامان کا حصول ہو نہ کہ مال۔ یعنی تقسیط پر اس لئے لیتاہے تاکہ اس کو بیچ کر مال حاصل کرلے، جمہور تو اس کو جائز قرار دیتے ہیں اور یہی صواب بھی ہے، کیونکہ وہ بیع ہے۔

اور"الأصل في البيوع الإباحة"۔

یہی صحیح ہے گو کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ([14])، حافظ ابن القیم ([15])، اور شیخ ابن العثیمین([16]) رحمہم اللہ نے اس کو اصل ربا قرار دیاہے۔ کیونکہ اس میں مال کو قصد تفاضلا ہوتاہے۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ یہ ربا نہیں ہے اس کو ہم قاعدہ "القصود مؤثرة في العقود"۔ کی روشنی میں پیش کریں گے۔ وہاں ہم نکاح طلاق کی نیت سے کرنے اور نکاح المسیار کے ضمن میں گفتگو کریں گے۔ اور یہ صورت بیع میں موجود ہے۔

ہم کہیں گے کہ یہ جائز ہے لیکن کچھ شروط کی بنیاد پر:

<u>پہلی شرط</u>: سامان بائع اول کو فروخت نہ کرے۔ اگر کردے تو وہ حرام ہے، اسی وقت بیچے یا کچھ دنوں بعد۔

<u>دوسری شرط</u>: اس میں بائع اول اور ثالث کے مابین کسی طرح کا اتفاق نہ ہو، یعنی کسی کمپنی اور بینک کا تقسیط پر کار فروخت کرکے یہ کہنا کہ یہ فلاں کو بیچ دو جو آپ کو زیادہ عطا کرے گا۔ یہ جائز نہیں ہے۔ ہاں اگر مذکورہ موانع نہ ہو تو مال ہی کیوں نہ مقصود ہو یہ جائز ہو گی۔

---

[14] - دیکھئے: مجموع الفتاوی: 431/29، 442/29، 302/30- 303، ومواضع أخر. وقال ابن القيم رحمه الله في " إعلام الموقعين ": ہمارے شیخ نے مسئلہ تورق سے منع فرمایاہے، آپ سے مراجعہ کی بارہا اپیل کی گئی مگر آپ نے کسی طور سے بھی ترخیص سے کام نہیں لیا، کیونکہ اس میں ربوی صورت موجود ہے تو وہ عین رباہے، اس میں اصل سے بڑھ کر لیا جاتاہے، اور اس میں نقصان ہے۔

[15] - إعلام الموقعين: 157/3، وحاشيته على تهذيب السنن: 249/9- 250

[16] - شیخ ابن العثیمین رحمہ اللہ نے کئی مقامات پر اس موضوع پر لکھاہے لیکن اس کے حرام ہونے کو جزما نہیں کہاہے، البتہ احتیاط کرنے کو کہاہے، بلکہ کچھ حالات میں اس کے جواز کا فتوی دیاہے، آپ کہتے ہیں کہ تورق اور ورع کا مسئلہ میں تعامل کو ترک کرنا ہی بہتر ہے البتہ اگر اس کی ضرورت محسوس ہو اور مشتری کو کوئی قرض دینے والا نہ ہو اور عہد نبوی میں معروف بیع السلم کی صورت بھی سامنے نہ ہو تو تین شروط کو سامنے رکھتے ہوئے اس کے لئے یہ جائز ہے۔" فتاوی نور علی الدرب"۔ اسی طرح شیخ رحمہ اللہ نے اپنے مجموع رسائل میں بھی کہاہے: لوگوں کی حاجتوں کو سامنے رکھتے ہوئے اور یہ بھی کہ لوگ قرض دینے والے کافی کم ہوتے ہیں، تو ایسی صوت میں کچھ شروط کی بنیاد پر وہ جائز ہے۔ پھر وہ مذکورہ شروط آپ نے بیان فرمائے ہیں۔ اس کے جواز پر شیخ ابن باز، شیخ صالح الفوزان اور شیخ فقیہ اصولی ابو عبد المعز فرکوس رحمہم اللہ گئے ہیں۔

اب دو مسئلے باقی رہ گئے ہیں جنہیں ان شاء اللہ مع شرح بیان کریں گے۔

پہلا مسئلہ جس کے تعلق سے جامعہ کے طلبہ سوال کرتے ہیں: وہ کینٹین کی طرف سے بونات کی بیع۔

جامعہ کے طلبہ مطعم سے بونات کی کم قیمت پر خریداری کرتے ہیں، اور اس کو دیگر طلبہ پر باہم اتفاق رائے والی قیمت پر فروخت کر دیتے ہیں، اس بنیاد پر کہ "الأصل في البيوع الإباحة"۔ یا یہ جائز نہیں ہے؟

یہاں ہم یہی کہیں گے کہ اگر مجرد اس مسئلہ پر غور کریں تو یہ جائز ہے، اس لئے کہ "الأصل في البيوع الإباحة"۔ لیکن یہ بیع جائز نہیں ہے، کیونکہ جب طالب علم یہ خریدتا ہے تو اس شرط پر کہ وہ خود ہی اس سے مستفید ہوگا، انتظامیہ سے یہی شرط لگائی جاتی ہے اسی لئے تو طلبہ کے لئے قیمت کم کی جاتی ہے۔

ایسے میں وہ دوسروں کو نہیں فروخت کر سکتا ہے، اس جامعہ کی طرف سے ہو یا دیگر جامعات کی طرف سے ہو سبھوں کے ہاں یہی شرط ہے ۔اس لئے اس پر ضروری ہے کہ وہ اس شرط کو پوری کرے۔ ان شاء اللہ آگے بیوع سے متعلق شروط کے بیان کے ضمن میں یہ قاعدہ آئے گا۔ البتہ وہ نہ بیچتے ہوئے کسی اور طرح کا تصرف کر سکتا ہے جس کو انتظامیہ نے منع نہیں کیا ہے، مثلاً کسی مہمان کو وہ پیش کر دے۔

دوسرا مسئلہ: شئیرز کی خرید وفروخت وغیرہ کے لئے شخصی کارڈ کی بیع۔ فی الحال یہ زیادہ رائج ہے، اس میں بطور انتفاع ایسا کیا جاتا ہے، مثلا کسی کمپنی سے از طریق اکتتاب یہ اعلان کیا جاتا ہے اور اسی پر یہ شخصی کارڈ مہیا کئے جاتے ہیں، ایک شخص کسی دوسرے کے لئے کارڈ کی خریداری کر کے اس سے اکتتاب کرتا ہے، اس کی مختلف صورتیں ہیں:

کہ ایک شخص اکتتاب میں زیادتی چاہتا ہے، یعنی اس کے پاس جو شخصی کارڈ ہے وہ پانچ لوگوں کے لئے ہوتا ہے وہ مزید دس سے بیس کو زیادہ کر لیتا ہے، تو وہ مزید کارڈ کی خریداری کر لیتا ہے۔

انہیں میں سے ایک یہ بھی کسی شخص کو انتظامیہ ممنوع قرار دیتی ہے کہ یہ اکتتاب صرف اپنی بستی والوں پر مقصور ہو، اس بستی میں آئے ہوئے مہمان کو وہ لینے کی اجازت نہ ہوگی کہ وہ بستی والوں کے لئے اکتتاب پر کارڈ خرید لے، اس کی کئی ایک صورتیں ہیں:

پہلی حالت: کہ ایک آدمی منفعت کے لئے بطاقہ خریدے مگر اپنے لئے اکتتاب کر لے، یعنی صاحب البطاقہ کو بطاقہ سے فائدہ اٹھانے کے لئے قیمت ادا کر دے، تو مال کے بدلے منفعت پر مبادلہ ہے، پھر وہ کمپنی کے لئے اپنے تئیں اکتتاب کرتا ہے، اس میں موجود تین علل کی وجہ سے یہ جائز نہیں ہے:

ABM PrintTime

پہلی علت: اس میں موجود جھوٹ ہے، اس لئے کہ اس میں بطاقہ کا خریدار یہ کہہ کر خرید تا ہے کہ میں یہ شئیرز اپنے لئے خرید رہا ہوں، جب وہ اپنے لئے نہیں خرید رہا ہے، حقیقت میں یہ جھوٹ ہے کیونکہ خلاف واقعہ امر ہے، اور یہ کبیرہ گناہ ہے۔

دوسری علت: اس میں انتظامیہ سے جو امور صلاح میں اطاعت ہونی چاہیے ان سے خروج ہے، اور یہ معصیت ہونے کی وجہ سے گناہ ہے۔

تیسری علت: اس میں کمپنی کا مال اس کی رضا کے بغیر کھانالازم آتا ہے، اس لئے کہ کمپنی اسی بات پر راضی ہوتی ہے جو اس کے نظام کے موافق ہو، ایک مسلم کے لئے یہی لازم ہے کہ وہ اپنے پاکیزہ کمائی سے کھائے۔ تو یہ پہلی حالت رہی۔

دوسری حالت: صاحب البطاقہ کا صاحب المال سے شئیرز کی خریداری میں شریک ہونا، صاحب البطاقہ اپنے بطاقہ کی وجہ سے اور صاحب المال اپنے مال کی بنیاد پر، اور دونوں پر سنٹیج پر آمدنی پر متفق ہوں، مثلا: صاحب المال یہ کہہ دے کہ میں ۸۰ فیصد آمدنی کا مستحق ہوں، اور آپ ۲۰ فیصد، تو یہ پہلی حالت سے الگ ہے اس لئے کہ اس میں جھوٹ نہیں ہے، لیکن دوسری والی علت کے انتفاء کا متحقق ہونا ضروری ہے، وہ کہ نظام سے خروج نہ ہو۔

نظام میں گنجائش ہو اور کمپنی اس کو منع نہیں کرتی ہے تو یہ بیع جائز ہے، اگر مذکورہ علل میں سے کوئی علت ہو تو پھر جائز نہیں، بیع کی دیگر صورتیں بھی قواعد کے ضمن میں آگے آئیں گی، ان شاء اللہ۔

ABM Print Time

دوسرا قاعده

"العبرة في العقود للمقاصد والمعاني لا للألفاظ والمباني"

ABM Print Time

مذکورہ قاعدہ کا صیاغہ جو ہم نے پیش کیا ہے وہ اہل علم کے پاس راجح قول کے مطابق ہے، اگر اس میں موجود اختلاف کو سامنے رکھیں گے تو اس قاعدہ کا صیاغہ کچھ اس طرح ہو گا: "هل العبرة بصيغ العقود ومبانيها أم بالمقاصد ومعانيها"

طلبہ کے حیطہ علم میں یہ بات ہے کہ اگر کسی قاعدہ کا صیاغہ استفہام سے شروع ہو تو یہ اس میں موجود اختلاف کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔

تو چونکہ یہ قاعدہ بصیاغہ استفہامیہ ہے تو اس کا معنی یہ ہے کہ آیا کسی عقد کے انعقاد میں محض الفاظ کا اعتبار ہو گا؟ جس سے کہ بیع والے الفاظ نہ ہوں تو یہ عقد مکمل نہ ہو گا۔ یا یہ کہ بیع سے متعلق صرف اس کے بیان اور اس کے مفاہیم سے ہی عقد ہو جائے گا؟

اس طرح عقد ہو گا کہ نہیں اہل علم کے مابین اختلاف ہے، جس میں دو رائے پائی جاتی ہیں۔

ان دونوں اقوال میں سے دوسرا قول ہی راجح ہے، جو کہ جمہور اہل علم کا قول ہے، حنفیہ اور مالکیہ کا یہی قول ہے، اور اگرچہ کہ حنابلہ اس میں مسئلہ میں متردد ہیں لیکن امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے معروف قول یہی ہے، شافعیہ کے مابین اس مسئلہ میں انتزاع ہونے کے باوجود قول راجح ان کے ہاں بھی یہی قول ہے، اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے جمہور اہل علم کے ہاں راجح قول یہی قرار دیا ہے کہ وہ معانی کو اصل مانتے ہیں، اور یہی قول صحیح ہے جسے ہم ان شاء اللہ بدلائل پیش کریں گے۔

جیسا کہ ہم نے کہا راجح قول یہی ہے کہ بیع میں معانی سے عقد ہو جاتا ہے، یعنی بیع اگر اپنے عقد میں واضح ہے تو یہی اس کے لئے کافی ہے، اب مثالوں کے ذریعے اس کے اختلاف کو واضح کیا جائے گا:

مثلا: ایک شخص کا کسی سے یہ کہنا کہ میں تمہارے مال کا اس شرط پر کفیل ہوں کہ وہ اس سے بری ہے۔ لیکن یہاں اس نے جو لفظ استعمال کیا ہے وہ ہے "کفالت"، اور بطور معنی کے "حوالہ" مراد لیا گیا ہے، ایسے میں لفظ ایک ہے اور معنی کچھ اور ہے۔ اگر ہم لفظ ہی مراد لیں تو یہ عقد ہی فاسد ہو گا، اس لئے کہ "کفالت" کی شرط رکھی گئی ہے جب کہ اس عقد میں اس کی مناقض شے بھی ہے، اس کی توضیح کے لئے "کفالت" کا معنی جاننا ضروری ہے۔

"الکفالۃ"

کا معنی ہے ایک کے ذمہ کو دوسرے کے ذمہ کر دینا۔ اس اعتبار سے وہ اصل سے اس کی مسوولیت ختم کر دیتا ہے، یعنی قرض ایک کی طرف سے دوسرے کے ذمہ آجاتا ہے، یوں اگر ہم الفاظ کا اعتبار کریں تو اس سے عقد کفالت ثابت ہو جاتا ہے، کیونکہ یہاں ادا کیا گیا لفظ "الکفالۃ" ہے، اور اس پر ہم فاسد کا حکم لگائیں گے، اس لئے کہ اس میں ایسی شرط لگائی گئی ہے جو اس کی نقیض ہے۔

اور اگر ہم معنی کا اعتبار کریں گے تو ہم اس کو "الحوالۃ" کے معنی میں لیں گے، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص کا قرض دوسرے کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، تو یہ عقد حوالہ ہے اور صحیح ہے، اس لئے کہ اس میں معنی کا اعتبار کیا گیا ہے، اور جمہور اہل علم کے قول کے مطابق یہ صحیح ہے۔

مذکورہ مثال بیوع کی نہیں ہے، اب ہم کچھ مثالیں بیع سے متعلق دیں گے:

مثلا: ایک شخص کا کسی سے یہ کہنا کہ میں اپنا گھر ایک ہزار ریال میں آپ کو ہبہ کر دیتا ہوں، یہاں اس شخص نے "ہبہ" کا لفظ استعمال کیا ہے، اور معنا بیع مراد ہے، اگر ہم یہ کہیں کہ: الفاظ اور مبانی کا اعتبار ہو گا، تو لازمی طور سے ہم کہیں گے کہ یہ ہبہ ہے اور ایک فاسد عقد ہے، اس لئے کہ اس میں ہبہ کرتے ہوئے عوض کو مشروط رکھا ہے، تو یہ فاسد ہے۔

اگر معنی کا خیال کریں تو یہ بیع صحیح ہے، اور ظاہر یہ ہے کہ یہ بیع ہے اور اس وجہ سے یہ صحیح ہے، جمہور اہل علم کا یہی موقف ہے۔

اس کی ایک اور مثال یہ ہے کہ: ایک شخص ایک شخص یہ کہتا ہے میں اس کپڑے کو اس کتاب کے بدلے آپ کو سونپتا ہوں۔ اس میں استعمال کیا گیا لفظ "السلم" ہے جب کہ مراد بیع ہے، الفاظ اصل ہوں تو یہ فاسد عقد ہے اس لئے کہ یہ ایک موجود شے کو "السلم" کہہ رہا ہے، اور اس میں موجود شرط بوصف بیع ہے، ہاں اگر معانی مراد لئے جائیں تو بیع صحیح ہے، کیونکہ اس میں بیع ہے، کہ اس نے اس کپڑے کو کتاب کے عوض بیچا ہے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ میں نے آپ کو میری کتاب بغیر قیمت کے بیچا ہے، تو یہاں لفظ بیع کا ہے، لیکن معنی ہبہ کا ہے، اگر یہاں بھی الفاظ مراد ہوں تو یہ عقد فاسد ہے، اس لئے کہ اس میں اس نے عوض کی نفی کی ہے۔

تنبیہ: یہاں یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ عوض کی نفی اور عوض پر سکوت میں فرق ہے۔ یہاں ہماری بحث نفی العوض سے ہے۔ یعنی کسی کا کہنا: میں نے آپ کو میری کتاب، میرے کپڑے، اور میرا گھر بغیر ثمن کے بیچ دیا ہے، اس میں عوض کی نفی ہے، اور اس میں اگر الفاظ ہی اصل ہوں تو یہ عقد فاسد ہو جاتا ہے۔ کیونکہ بیع میں عوض کا ہونا مشروط ہے۔

لیکن اگر کوئی عوض کی نفی نہیں کرتا لیکن سکوت اختیار کر لیتا ہے، تو شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور کچھ دیگر اہل علم رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ یہ بیع منعقد ہو جاتی ہے، پھر عوض عادۃ جو ہو گی وہ طئے ہو جائے گی یہ پھر طرفین کی رضامندی سے جو طئے ہو وہ عوض بن جائے گا۔ البتہ یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے، لیکن ہمارا مسئلہ نفی العوض کا ہے۔

خلاصہء کلام یہ کہ اگر الفاظ کا خیال کریں تو عقد فاسد ہے بصورت دیگر عقد صحیح ہے۔

اگر کسی نے یہ کہا: میں آپ کو میرا گھر ایک ماہ کی مدت کے لئے بطور انتفاع فروخت کرتا ہوں، یہاں لفظ بیع کا ہے اور معنی اجرت کا ہے، اگر معنی ہی مراد ہے تو بیع صحیح نہیں ہے، کیونکہ اس میں ایک مدت بیان کی گئ ہے، ہاں اگر مقاصد اور معانی مراد لئے جائیں تو یہ بیع صحیح ہو گی۔

یہ ساری مثالیں اہل کے نزدیک مختلف فیہ ہیں، جسے انہوں نے ہی پیش کیا ہے، یہ سب حقیقی مثالیں ہیں افتراضی نہیں ہیں، اس میں اہل علم کی دو رائے ہیں:

راجح جیسے کہ ہم نے قاعدہ میں ہی کہا ہے کہ اعتبار معانی اور مقاصد کا ہو گا، اس فکرہ کی شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور حافظ ابن القیم رحمہا اللہ نے خوب ترویج کی ہے۔

اعتبار معانی کا ہی ہو گا اس پر بہت سارے دلائل ہیں۔

سب سے اہم دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے کہ: «إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوَى»[17] یہ حدیث مبارکہ سبھی معتمد علیہ کتابوں میں موجود ہے، اس میں آپ صَلی اللہ علیہ وسلَم نے اعمال کو مقاصد پر حصر کیا ہے، کہ جو شخص جو کرے گا اس کا دارومدار اس کی قصد پر ہے نا کہ اس کے الفاظ پر۔

اس کے دلائل میں سے یہ بھی ہے کہ الفاظ پر اعتبار کرنے سے زیادہ بہتر ہے قصد اور ارادوں پر اعتبار کرنا۔ اس لئے کہ الفاظ دراصل اس کے مقاصد کے غماز ہوتے ہیں۔

مقاصد ہی اصل مراد ہوتے ہیں، اس اعتبار سے وسائل کو مراد لینے سے بہت بہتر ہے کہ اصل کو مراد لیا جائے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے: الفاظ مراد کی تفہیم کے لئے وسیلہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تو اصل کو ہی مراد لینا ہر لحاظ سے بہتر ہوتا ہے۔

انہیں دلائل سے میں وہ بھی ہے جسے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے قرار دیا ہے وہ یہ کہ: اصل مقصود متکلم کی فہم ہے، متکلم کے الفاظ کی جو مراد ہوتی ہے وہی مقصود ہوتا ہے۔

حدیث ابو حمید الساعدی رضی اللہ عنہ سے بھی اس قاعدہ کے لئے استدلال کیا جاسکتا ہے، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ ازد کے ایک صاحب ابن اللتبیہ کو زکاۃ کے حصول پر پابند کیا تھا، جب وہ واپس آئے اور حساب کتاب ہوا تو کہنے لگے یہ آپ کا اور یہ میرا، تو رسول اللہ

[17] - في الصحيحين وغيرهما من حديث عمر رضي الله عنه.

ABM PrintTime

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «فَهَلَّا جَلَسْتَ فِي بَيْتِ أَبِيكَ وَبَيْتِ أُمِّكَ حَتَّى تَأْتِيَكَ هَدِيَّتُكَ»([18]) پھر آپ نے حدیث مذکور میں جو قصہ تھا اس کو بیان فرمایا، اور حدیث متفق علیہ ہے۔

حدیث مذکور میں وجہ استدلال یہ ہے کہ قبیلہء ازد کے یہ صاحب جب انہیں ہدیہ دیا گیا تو یہی لفظ ان سے کہا گیا تھا کہ: آپ ہدیہ قبول فرمائے۔ اور ہدیہ امور مباحات میں سے ہے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے الفاظ پر نہیں مقاصد پر غور فرمایا اور اس کو پیش نظر رکھا، اسی لئے آپ نے مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کو لینے سے منع فرمایا: «فَهَلَّا جَلَسْتَ فِي بَيْتِ أَبِيكَ وَبَيْتِ أُمِّكَ حَتَّى تَأْتِيَكَ هَدِيَّتُكَ» کہ یہ ہدیہ نہیں ہے بلکہ آپ اس کے عاملین میں سے تھے اس لئے آپ کو دیا گیا ہے۔ اگر یہ آپ ہی کا ہدیہ ہوتا تو آپ کو آپ کے گھر بیٹھے ہی مل جاتا، تو اس اعتبار سے یہ آپ کا ہدیہ نہیں ہے، تو غور طلب بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے الفاظ کی رعایت نہیں کی بلکہ مقاصد کو سامنے رکھ کر اس سے منع فرمایا۔

انہیں دلائل میں سے ایک دلیل وہ بھی ہے جسے شیخ الاسلام نے ذکر کیا ہے، دراصل یہ آپ کی فقہی بصیرت پر دلالت کناں ہے، آپ فرماتے ہیں: عقد ایک جنس ہے اس میں تعبد مشروع نہیں ہے، یعنی اس میں لفظا تعبد مشروع نہیں ہے، شیخ الاسلام نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ اس میں ایمان کی شرط نہیں ہے، بلکہ یہ عمل کافر سے بھی صحیح ہے، اور جس میں ایمان کی شرط نہ ہو وہ امر تعبد نہیں ہو سکتا ہے۔

گویا شیخ الاسلام یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ ہی نے تو کہا ہے کہ الفاظ کا ایک اعتبار ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ عقود میں الفاظ کی حیثیت تعبدیہ کی ہے۔ لیکن ہم یہ کہیں گے کہ عقود ایک جنس ہے اس میں تعبد مشروع نہیں ہے، اس لئے کہ اس میں کافر سے ہونے والا عقد صحیح ہے، اور اس میں ایمان مشروط نہ ہونے کی وجہ سے یہ امر تعبد نہیں ہو سکتا ہے۔

ان دلائل میں سے ایک واضح دلیل یہ بھی ہے کہ عقود میں الفاظ کا مشروط ہونا اس پر کوئی دلیل وارد نہیں ہے، اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے متعلق کچھ الفاظ کہے ہوتے تو از طریق صحابہ ہمیں وہ ضرور ملتے، یہ خود ایک دلیل ہے کہ اس میں الفاظ مشروط نہیں ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح، طلاق اور عتاق وغیرہ میں ازراہ مذاق بھی کسی نے کہہ دیا ہو تو آپ نے اس کو شمار کیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں الفاظ کا اعتبار کیا نا کہ مقاصد کا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «ثَلَاثٌ جِدُّهُنَّ جِدٌّ وَهَزْلُهُنَّ جِدٌّ النِّكَاحُ وَالطَّلَاقُ وَالرَّجْعَةُ»([19]) ان حضرات کا یہ کہنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں نکاح میں ہزل

---

[18] - أخرجه البخاري في " صحيحه ": كتاب الأحكام، باب محاسبة الإمام عماله.

[19] - امام ابو داود رحمہ اللہ نے اس روایت کو بسند ضعیف لائے ہیں، کأخرجه أبو داؤد: كتاب الطلاق، باب الطلاق على الهزل. برقم: 2196، حسنه الشيخ الألباني رحمه الله

ABM PrintTime

کا بھی اعتبار کیا کیونکہ آپ نے الفاظ کی رعایت کی ہے۔ اگر کسی شخص نے کسی سے ازراہ مذاق یہ کہہ دیا کہ میں آپ کو میری بیٹی سے بیاہ کر دیا ہوں، اور سامنے والا بھی یہ کہہ دیا کہ میں نے اسے قبول کیا ہے۔ تو نکاح اپنے شروط پر یہاں تمام ہو جاتا ہے، جب کہ یہ ایک مذاق تھا اس میں مقصدیت نہ تھی بلکہ صرف ظاہری الفاظ تھے، اسی طرح طلاق کا مسئلہ بھی ہے، اگر کسی شخص نے اپنی عورت سے کہہ دیا کہ تجھے طلاق ہے، اور وہ اس سے مذاق کیا تھا، تو وہ طلاق واقع ہو جائے گی۔

ان حضرات کا یہ کہنا کہ اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے الفاظ کا اعتبار کیا ہے، مقصد کا اعتبار نہیں فرمایا، تو ہم اس کے جواب میں دو باتیں عرض کریں گے:

پہلی بات: یہ عقود شریعت میں اپنا ایک امتیازی مقام ہونے کی وجہ سے خصوصیت رکھتے ہیں، اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات ہر عقد سے متعلق نہیں فرمائی ہے۔ اس کو بس نکاح وطلاق سے جوڑے کھا اس لئے کہ یہ اعراض سے متعلق ہے، اور شارع نے اعراض سے متعلق جو احتیاط برتی ہے وہ دیگر عقود میں نہیں ہے۔

اسی لئے زنا ایسے ہی نہیں ثابت کیا جاتا ہے بلکہ چار گواہ ضروری ہیں جو دقیق شروط پر مبنی ہیں۔ رہا قصاص کا مسئلہ تو دو گواہوں پر قائم ہو جاتا ہے، اس لئے کہ زنا اعراض سے متعلق ہے، اور شریعت اس اعراض میں احتیاط برتتی ہے، اور نکاح وطلاق اعراض سے ہے۔

اور عتق اس پر شریعت حوصلہ افزائی کرتی ہے، تو یہ ان عقود سے متعلق خاص ہے، کوئی عام قاعدہ نہیں ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس میں ہازل اپنی زبان سے جو الفاظ نکالتا ہے وہ انہیں اچھی طرح جانتا ہے، لیکن بس اس کا حکم نہیں چاہتا ہے۔

ایک ہازل جب یہ کہتا ہے کہ: "میں نے اپنی بیٹی کو آپ کے نکاح میں دے دیا" تو اس کلام کے معنی کو جانتا ہے، اور اس کلام کو وہ چاہتا بھی ہے، لیکن اس کے حکم کو نہیں چاہتا کہ وہ منعقد ہو جائے، وہ نکاح کے معنی سے بے خبر نہیں ہے، اور ایسا بھی نہیں کہ وہ نکاح کہہ کر کچھ اور مراد لے رہا ہے، جیسے نکاح کہہ کر بیع مراد لے لے، یہاں بس وہ یہ نہیں چاہتا ہے کہ اس کے کہنے کے مطابق وہ منعقد بھی ہو جائے، اس اعتبار سے بات واضح ہے کہ ہازل کلام کا معنی بھی جانتا ہے اس کو چاہتا بھی ہے لیکن انعقاد نہیں چاہتا۔ تو یہ اس کے لئے نہیں بلکہ شریعت کے لئے ہے اسی لئے اس کے اس کلام کو اس کے حکم میں داخل کر دیا گیا۔

اس قاعدہ کی روشنی میں اس پر یہ مرتب ہو جاتا ہے کہ کوئی بھی بیع کیوں نہ ہو افعال والفاظ میں سے کوئی بھی شے اس پر دلالت کرے تو وہ منعقد ہو جاتی ہے۔ تو بیع کے لفظ پر وہ منعقد ہو جاتی ہے جو کہ فقہاء کے نزدیک ایجاب وقبول کے سے ہوتی ہے، اور یہ محل اجماع ہے، بائع کی طرف سے ایجاب اور مشتری کی طرف سے قبول، ان الفاظ سے بیع منعقد ہو جاتی ہے۔ جمہور اہل علم کے نزدیک آپسی معاطاۃ سے بیع منعقد ہو جاتی ہے۔

ABM PrintTime

معاطاۃ کا معنی یہ ہے کہ طرفین میں سے دونوں طرف سے یا کسی ایک سے فعلا بیع کا واقع ہونا ہے۔ یعنی مشتری کا بائع سے یہ کہنا کہ مجھے ایک ریال پر ایک روٹی فروخت کرو، تو بائع اس کو ایک روٹی دیتا ہے جب کہ اس کو جوابا کچھ نہیں کہتا۔ اب فعل کس سے واقع ہوا ہے؟ یہاں بائع سے فعل صادر ہوا ہے۔ یا بائع کا مشتری سے یہ کہنا: کہ ایک ریال پر اس روٹی کو لو، اور مشتری وہ روٹی ایک ریال پر لے لیتا ہے اور جوابا کچھ نہیں کہتا۔ اس صورت میں یہ فعل مشتری سے صادر ہوا ہے، یا ایسا ہوتا ہے کہ مشتری بائع کو ایک ریال دیتا ہے اور وہ اس کو ایک روٹی دیتا ہے تو یہ فعل دونوں سے صادر ہوا ہے۔

بیع المعاطاۃ: جمہور اہل علم کے نزدیک یہ ایک صحیح بیع ہے، اس لئے کہ اس پر یہ قاعدہ "أن العبرة بالمقاصد والمعاني" منبطق ہوتا ہے۔ اور اس لئے بھی کہ شریعت نے بیع کو بغیر تحدید کے مطلق رکھا ہے، اور لغت میں بھی اس کی کوئی حد نہیں ہے، تو اس میں عرف کی طرف رجوع کیا جائے گا، اور اہل اسلام اس کا بیع المعاطاۃ میں معاملہ کا روا رکھنا معروف ہے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیع میں کسی طور سے بھی ایجاب وقبول والی شروط منقول نہیں ہیں، اس لئے یہ "عفو" میں معدود ہوگا جس سے لوگ اپنے حساب سے عرفا اس کو انجام دیں گے۔ اور مسلمانوں کا اس میں بیع المعاطاۃ کو بغیر نکیر کے روا رکھنا اس کے اجماع ہونے کی دلیل ہے، اس طرح بیع المعاطاۃ کے جواز ہونا معلوم ہوتا ہے۔

مذکورہ اصول کی روشنی میں یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ بکتابت بھی بیع جائز ہے، یعنی بائع کا ایجاب بکتابت کرنا اور مشتری کا بکتابت قبول کرنا ہے۔ ہاں اگر وہ دونوں ایک ہی مجلس میں ہوں اور عقد ہو تو ایسی صورت میں وہ ایجاب وقبول کے حکم میں ہوگا۔ اس لئے کہ ایجاب وقبول کا ایک ہی مجلس میں ہونا ضروری ہے گرچہ کہ کاتب غائب ہی کیوں نہ ہو، اس لئے کہ جمہور اہل علم کے نزدیک کتابت پر رد اسی وقت ہوگا جب وہ اور جس مجلس میں پڑھ کر سنائی جائے۔ مثلا: آپ فی الحال یہاں مدینہ نبویہ میں ہیں اور اپنے آبائی وطن میں گھر کی خریداری کرنا چاہتے ہیں، تو آپ ایک خط صاحب البیت کے نام لکھتے ہیں کہ آپ اتنی قیمت پر گھر فروخت کیجئے، جب خط اس کو پہنچتا ہے تو وہ اس بیع کو قبول کر لیتا ہے، ایسی صورت میں جمہور اہل علم کے ہاں یہ بیع منعقد ہو جاتی ہے، اسی مذکورہ قاعدہ "أن العبرة بالمقاصد والمعاني" کی روشنی میں بیع بکتابت صحیح ہے۔

اس لئے بھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بادشاہوں کے نام دعوت اسلام کے لئے خطوط لکھے ہیں، اسلام میں اس عظیم کام کے لئے جب خط وکتابت روا ہے تو اس سے ادنی کے لئے باب اولی جائز ٹھہرتا ہے۔ اور انہیں میں بیع بھی ہے۔

اسی کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بھی ہے کہ بیع بذریعے فیکس بھی منعقد ہوتی ہے، کہ کوئی لکھ کر فیکس کردے، اسی طرح انٹرنیٹ سے بھی بیع ہو سکتی ہے، دونوں کی طرف سے رضامندی ہو تو اس سسٹم کا استعمال کرتے ہوئے اشیاء کی خرید وفروخت ہو سکتی ہے۔ اور جمہور اہل علم کے نزدیک یہ بیع اس قاعدہ "أن العبرة بالمقاصد والمعاني" کی روشنی میں درست ہے۔ اس اصل کو سامنے رکھتے ہوئے بیع سے متعلق جو شروط ہیں ان کا لحاظ ضروری ہے۔

ABM PrintTime

تیسرا قاعدہ

"القصود مؤثرة في العقود"

ABM PrintTime

تیسرا قاعدہ اس سے قبل والے قاعدہ سے قریب المعنی ہے، جو کہ اہل علم کا یہ قول ہے: "القصود مؤثرة في العقود"

یہ قاعدہ اس صیاغہ سے اس حالت میں ہو گا جب کہ ہم اس کو بطور راجح بیان کریں، لیکن اگر اس میں موجود اختلاف کو بیان کریں تو اس کا صیاغہ اس طرح ہو گا: "هل القصود مؤثرة في العقود؟"

اس قاعدہ کا معنی یہ ہے: عقد میں اعتبار اس کی ظاہر پر ہو گا، اور اس کی تکمیل ظاہری شروط پر ہو گی یا اس کے مقاصد پر بھی غور کرنا ہو گا؟ یعنی اس عقد پر حکم لگانے کے لئے اس کے ظاہر کو دیکھنے پر اکتفا کریں گے یا اس کے مقاصد پیش نظر ہونا ضروری ہے؟

اہل علم کے اقوال کی روشنی میں راجح یہ ہے کہ: "القصود مؤثرة في العقود" قصد کا ایک گونہ حصہ ہوتا ہے حکم لگانے میں، اسی لئے اگر ہم اس کے قصد میں فساد پائیں اور وہ ظاہر ہو جائے تو اس عقد کے ظاہر افساد ہونے پر حکم لگائیں گے، اگر ہم مطلع نہ ہوں تو یہی کہیں گے کہ یہ عقد باطنا فاسد ہے، یعنی یہ معاملہ بندے اور رب کے درمیان ہے، البتہ اس کے ظاہر پر ہم حکم نہیں لگائیں گے کیونکہ ہم اس کے باطن سے واقف نہ ہو سکے۔

اس قاعدے کی وضاحت ایک مثال سے پیش کریں گے: ایک شخص نے کسی مطلقہ عورت سے نکاح کیا جو کہ مطلقہ بائنہ تھی، البتہ ارادہ یہ تھا کہ اس شادی کے ذریعے وہ اس کو طلاق دے تاکہ پہلے والے کے لئے وہ حلال ہو جائے، ظاہر پر غور کریں تو ہم یہی کہیں گے کہ یہ عقد صحیح ہے، کہ اس شخص نے ایجاب و قبول، مہر اور ولی، شاہد اور علانیہ شادی کی ہے، اور اس کی عورت پر داخل ہوا دونوں آپس میں متلذذ ہوئے پھر اس نے اس عورت کو طلاق دی، اور یوں پہلے والے کے لئے حلال ہو گئی۔

اگر ہم یہ کہیں کہ "العقود مؤثرة في العقود" تو یہ پہلے والے کے حق میں حلال نہیں ہے۔

اگر ہمیں وہ پہلے سے خبر ہو تو اس کو سرے سے نکاح کرنے ہی نہیں دیتے، اور اگر اس سے مطلع نہ ہوں تو یہی کہیں گے باطنا وہ پہلے والے کے حلال نہیں ہو گی، یعنی ہم یہ نہیں کہیں گے ہم اس کے عدم حلال کا حکم لگاتے ہیں، کیونکہ ہم اس کے قصد سے مطلع ہی نہیں ہیں، لیکن ہم یہ کہیں گے کہ اس کے ارادہ فاسدہ کی وجہ سے وہ پہلے والے کے حلال نہیں ہے۔

اس کی ایک اور مثال: گرچہ کہ یہ مثال بیوع سے خارج ہے، اسی لئے بارادہ طلاق نکاح کرنے کی سرخی لگائی گئی ہے۔

طلاق کے ارادے سے نکاح کرنا: اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کا ایک عورت سے اس نیت سے نکاح کرنا کہ وہ اس سے ایک مدت بعد علاحدگی اختیار کرلے گا، جیسے پڑھائی ختم ہونے کے بعد یا اجازہ مکمل ہونے کے بعد یا ماہ اور اسبوع کی مدت تک ساتھ رہنا ہے پھر جدا ہونا ہے۔ اہل علم کے اقوال کی روشنی میں صحیح بات یہ ہے کہ یہ نکاح اس قاعدہ "العقود مؤثرة في العقود" کی روشنی میں جائز

نہیں ہے، اور بھی دیگر وجوہات ہیں جو اس کے حرام ہونے پر دلالت کناں ہیں لیکن اس وقت بیوع کی بابت اس تفصیل کی گنجائش نہیں ہے، البتہ صرف اس قاعدہ کی تفہیم مقصود ہے۔

اب بیع سے متعلق ہی مثال عرض ہے، ایک شخص نے ازراہ مذاق بیع کی جس میں وہ بیع کا انعقاد نہیں چاہتا ہے، جیسے کوئی کہے کہ آپ مجھے اپنا گھر بیچ دیں، تو سامنے والے نے کہا کہ میں نے اپنا گھر نصف ریال میں فروخت کرتا ہوں، یہاں بات بالکل واضح ہے کہ یہ ایک مذاق ہے، اس لئے کہ عقلاء کے ہاں کے یہ معروف ہے کہ کوئی بھی گھر کو نصف ریال پر فروخت نہیں کرتا ہے، تو جمہور اہل علم کے ہاں "بيع الهزل" منعقد نہیں ہوتی ہے، اس لئے کہ اس میں ارادہ بیع نہیں ہے، اور اعتبار قصد کا ہوتا ہے۔ "القصود مؤثرة في العقود"۔

اور جن حضرات نے ظاہر کو اصل مانا ہے ان کا کہنا ہے کہ بیع منعقد ہو چکی ہے۔ اگر کسی نے نصف ریال پر بیع کر دی تو مشتری اب اس گھر کا مالک ہو گا۔ لیکن جمہور اہل علم کی بات ہی زیادہ صحیح ہے وہ ہے کہ بیع منعقد نہیں ہو گی، کیونکہ: "القصود مؤثرة في العقود"۔

اسی طرح وہ بیع بھی جسے " بیع التلجئۃ " کہتے ہیں، جس میں انسان بیع وشراء کے اظہار میں آگے آتا ہے تاکہ اس سے ظالم کے ظلم کو روک لگ جائے۔

آپ سے کبھی کوئی ظالم آپ کا گھر ہڑپنا چاہتا ہے اور اس وہ اس پر قادر بھی ہوتا ہے، تو آپ ایسی صورت میں آپ کے کسی بھائی یا دوست کے پاس جاتے ہیں جس پر یہ ظالم قدرت نہیں رکھتا ہے، تو بھائی اس ظالم کے ظلم کو روکنے کے لئے کہتا ہے کہ میں اس گھر کو خرید رہا ہوں۔ اور آپ اپنے اس بھائی کو یہ گھر ایک لاکھ ریال پر فروخت کر دیتے ہیں، اور وہ اس کو قبول کر لیتا ہے، تو اسی بیع کو بیع التلجئۃ کہتے ہیں، کیونکہ انسان اس طریق کو اپنے سے ظلم کو روکنے میں کامیاب ہو جاتا ہے، اسی لئے وہ اس کی طرف پناہ لیتا ہے۔

لیکن اس بیع میں خرید و فروخت مقصود نہیں ہوتی ہے بلکہ صرف ظلم کا دفاع مقصود ہے اس لئے اہل علم کے نزدیک یہ بیع درست نہیں ہے اور وہ منعقد بھی نہیں ہوتی ہے۔ اور یہی صحیح قول ہے۔ ہاں اگر ظاہر کو لیں تو بیع منعقد ہو جاتی ہے، اس لئے کہ ارکان البیع سب موجود ہیں۔

انہیں مذکورہ بیوع میں سے ایک بیع التقسیط بھی ہے، جس میں مال کا حصول ہی اصل مقصود ہوتا ہے، کہ ایک انسان کچھ سامان کی خریداری کرتا ہے جس میں قیمت کی ادائیگی کے لئے ایک مدت ہوتی ہے، سامان کا حصول اصل نہیں ہوتا کہ اس میں اس کی رغبت ہو بلکہ مال کا حصول اصل ہوتا ہے، اب یہاں اس کی دو حالتیں ہوتی ہیں:

پہلی حالت: کہ وہ تجارتی عقد میں کسی اجنبی سے مال حاصل کرے۔ اس میں قصد صحیح ہونے کی وجہ سے عقد صحیح ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ ایک شخص شادی رچانا چاہتا ہے، نکاح کا ارادہ ہے لیکن اس کے لئے مال نہیں ہے، تو وہ زید سے تقسیط کے طور سے کار خریداری کرتا ہے، تاکہ وہ عمرو کو اس حالت میں بیچے کہ علی الفور اس کی قیمت ادا ہو جائے اور یوں وہ مال کا حصول کا ذریعہ

ABM Print Time

ہو جاتا ہے، تو یہاں وہ عمرو سے مال حاصل کرنے کا ارادہ کیا ہے جب کہ وہ پہلے والے شخص کے لئے ایک اجنبی ہے، ایسی صورت میں جمہور اہل علم کے ہاں اس بیع کے جواز میں کوئی اشکال نہیں ہے، یہ صحیح بیع ہے، اس میں کوئی فاسد شے نہیں ہے۔

دوسری حالت: کہ پہلے والے بائع سے مال حاصل کیا جائے۔ اس کی دو صورتیں ہیں:

پہلی صورت: کہ وہ ثمن موجل سے بائع سے سامان خریدے پھر اسی بائع کو علی الفور ملنے والی مگر کچھ کم قیمت پر وہ سامان فروخت کر دے، یہ حرام ہے اور صحیح عقد نہیں ہے، کیونکہ یہ بیع العینہ ہے اور سود کے حصول کے لئے ایک حیلہ ہے۔

دوسری صورت: کسی تیسرے سے مال حاصل کیا جائے جو کہ پہلے والے بائع سے متفق اور جڑا رہتا ہے۔ ایک حلقہ ہوتا ہے، اور سامان اس میں گھومتا رہتا ہے اور یہ ہزاروں پر فروخت کیا جاتا ہے، جیسے کچھ بینکوں میں یہ واقع ہوتا ہے۔ کہ سامان کو از طریق تقسیط فروخت کرنا، پھر یہی مشتری کسی اور کو جو کہ معین ہوتا ہے اس کو فروخت کر دیتا ہے، پھر وہ معین شخص اس کو بینک سے باتفاق اس کو بیچ دیتا ہے۔

یہ بھی پہلی والی حالت ہی کے موافق ہونے کی وجہ سے حرام ہے، یہ عینہ کے باب سے ہونے کی وجہ حرام ہے اور یہ ربا پر ایک طرح کا حیلہ ہے۔ تو یہ اثر القصود فی العقود کے باب سے ہے۔

ہمارا یہ کہنا کہ عقود پر قصد وارادے کا نہایت اثر واقع ہوتا ہے، تو اس کی دلیل کیا ہے؟ یہاں ہم یہ عرض کریں گے کہ اس پر اہل علم نے کئی دلائل پیش کئے ہیں:

اللہ تعالی نے فرمایا:﴿وَبُعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا إِصْلَاحًا﴾(البقرة: 228) اس آیت کریمہ میں اللہ تعالی نے شوہر کو بیوی کی طرف رجوع کرنے کے سلسلے میں حق عطا کیا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ وہ اصلاح کا ارادہ رکھے۔ اس میں ارادہ کو مشروط رکھا گیا ہے، یعنی اس آیت کریمہ کا معنی یہ ہے کہ وہ حق رجوعیت اصلاح کی شرط پر موقوف ہے، اور اگر ارادہ فساد کا ہو جیسے کہ اس کی طرف رجوع کر کے اس کی عدت میں اضافہ کر کے اس کی تعذیب مقصود ہو، جب عدت پوری ہونے کی ہو تو پھر اس کو طلاق دے دے، یہ حرام ہے، کبھی یہ بھی مقصود ہوتا ہے کہ اس خاتون کو کسی اور سے نکاح کا زرین موقع ہوتا ہے تو اس موقع کو ختم کرنا مقصود ہوتا ہے، کسی کو اس بات کا علم ہوا کہ اس کی عدت مکمل ہونے کے بعد اس سے بیاہ کر لے گا تو انتہائے وقت میں اس کی طرف رجوع کر کے اس کو ملنے والے موقع کو ختم کر دیتا ہے تا کہ وہ بھلا شخص اس سے نکاح نہ کرے اور یوں اس کو تکلیف دینا مقصود ہوتا ہے، یہ جائز نہیں ہے۔ یہ بھی اس بات پر دلالت کناں ہے کہ ارادہ وقصد کا اعتبار ہے۔

ABM Print Time

انہیں دلائل میں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان: « إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوَى»[20] یہ قاعدہ شرعی طور سے ایک عام قاعدہ ہے، جس میں اس بات کی توضیح کی گئی ہے کہ قصد پر ہی اعتبار ہو گا۔

اس سلسلے میں ایک حدیث مبارکہ ہے جسے اہل علم نے پیش کی ہے، ایک روایت بیان کی جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص کسی عورت سے مہر ادا کرنے کا دم بھرتے ہوئے شادی کرتا ہے اور اس نیت کے ساتھ کہ وہ مہر ادا نہیں کرے گا تو وہ زانی ہے۔([21]) اس حدیث کو امام ابو بکر البزار رحمہ اللہ نے انہیں الفاظ سے نقل کیا ہے، اور امام عبد الرزاق الصنعانی رحمہ اللہ نے اس معنی کی روایت نقل کی ہے لیکن اس کی سند ضعیف ہے، تاہم بعض اہل علم اس قاعدہ کے لئے بطور دلیل کے اس کو پیش کئے ہیں۔

ان اہل علم میں سے حافظ ابن القیم رحمہ اللہ بھی ہیں اور آپ نے کچھ شواہد بھی پیش کئے ہیں جس سے اس کی تقویت ہوتی ہے، مجھے اس کو تقویت ملتی ہو ایسا نہیں لگتا، البتہ اس سے کیا گیا استدلال ہم نے پیش کر دیا ہے، جس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کے حق میں زانی ہونے کا حکم لگائے ہیں جو کسی عورت سے مہر کو ادا نہ کرنے کی نیت سے شادی کرتا ہے۔ ظاہر میں مہر کا ذکر ہے لیکن ارادۃ مہر نہ دینا اصل مقصود ہے، ہاں حدیث میں کچھ ضعف ہے جیسے کہ اوپر گذر چکا ہے۔

اسی طرح ابو حمید سے مروی حدیث سے بھی استدلال کیا جاتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قصد کا اعتبار کیا نا کہ عمل کا۔

یہاں ایک بات قابل غور ہے وہ یہ کہ ہم نے کہا تھا کہ قصد میں اگر فساد ہو تو اس پر حرام ہونے کا حکم لگایا جائے گا لیکن ارادہ کا تعلق قلب اور دل سے تو ہم اس سے واقف کیسے ہوں گے؟ جی ہاں ہم قصد سے کبھی واقف ہو سکتے ہیں اور کبھی نہیں، جب واقف ہوں گے تو ان امور کے ذریعے سے:

پہلی بات: کوئی بصراحت اپنے فاسد ارادے سے واقف کرادے، جیسے کسی کا کہنا کہ میں فلاں عورت سے اس لئے شادی کر رہا ہوں کہ وہ اس کے شوہر کے لئے حلال ہو جائے، اس کے علاوہ میرا کوئی ارادہ نہیں ہے، تو اس میں صراحت ہو گئی ہے۔

دوسری بات: عرف کے ذریعے سے کہ کسی نے از نیت طلاق کے شادی کی، جیسے کسی بستی میں یہ معروف ہو کہ طلاق کی نیت سے شادی کی جاتی ہے، کہ ایک شخص اس اعتبار سے شادی کرتا ہے کہ چھٹی کے ایام میں گھر جاتے ہوئے اس کو طلاق دے دے گا، عرف سے یہ بات

---

[20] - في الصحيحين وغيرهما من حديث عمر رضي الله عنه.

[21] - وهو عنده من حديث أبي هريرة رضي الله عنه، وبنحوه أخرجه الرافعي وابن النجار كما في " جامع السيوطي " عن صهيب وهكذا الخطيب البغدادي.

ABM Print Line

معلوم ہو جاتی ہے، بسا اوقات اس میں لوگ دو تین اور چار شادیاں کر لیتے ہیں، بعض ایک ہی دن میں شادی اور اسی دن میں طلاق، یہ سب عرفاً معلوم ہو جاتے ہیں۔

کبھی قرائن سے معلوم کیا جاتا ہے، جیسے ایک شخص اپنے گھر میں ہوتا ہے اس کو کوئی ہدیہ نہیں ملتا ہے، لیکن صاحب منصب ہوتا ہے تو اس کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، وہ اسی محلہ کا ہے لوگ جانتے ہیں کہ اس کو کوئی ہدیہ دینے والا نہیں ہے لیکن اب؟ اس طرح کبھی اس کا گذر ہوتا ہے کوئی سلام کرنے والا نہیں۔

لیکن اب اس کو ایک بڑا منصب مل جاتا ہے، اب ملنے والا ہدیہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس منصب کی وجہ سے ہی ہیں، جیسے ابھی کچھ قبل ایک شخص جو قبیلہ ازد کے تھے ان کا قصہ گذرا ہے، جن سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بتلایا گیا تھا۔

اور کبھی کچھ الفاظ سے بھی معلوم کیا جاتا ہے، جس میں صراحت نہیں ہوتی ہے البتہ پتہ لگ جاتا ہے، دوران عقد الفاظ میں اس کا قصد معلوم ہو جاتا ہے ایسے میں اس عقد پر قصد کا اثر واقع ہوتا ہے۔ اس معاملے میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور ابن القیم رحمہما اللہ نے بہت پر زور انداز سے علمی طور پر اس کو کئی ایک مقامات پر واضح کیا ہے۔

ABM PrintTime

چوتھا قاعدہ

"إنما البيع عن تراض"

ABM PrintTime

بیوع سے متعلق چوتھا قاعدہ جسے اہل علم نے بیان کیاہے:" **إنما البيع عن تراض** "

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس قاعدہ کو اس صیاغہ سے پیش کیاہے: " **الأصل في العقود رضا الطرفين** ".

یہ قاعدہ اپنے پہلے والے صیاغہ میں لفظاومعنانصوص سے ماخوذ ہے، اس لئے کہ یہ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے لیا گیاہے۔

یہ قاعدہ بیوع سے متعلق ایک عظیم شرط پر دلالت کرتا ہے، وہ یہ کہ طرفین کا عقد پر رضامند ہونا۔ ہم اس کو ایک عظیم شرط قرار دیا ہے اس لئے کہ حدیث میں بیع کو رضامندی پر منحصر رکھا گیاہے جو کہ اس کی اہمیت پر دال ہے۔

اس طرح بائع ومشتری پر یہ لازم ہے کہ وہ دونوں آپسی رضا کا خیال رکھیں، اوران کی آپسی رضا سے ہی بیع منعقد ہوتی ہے، بس اتنالحاظ ہونا چاہیے کہ اس رضامیں شرعی طور سے مخالفت نہ ہو۔

اور بیع میں رضامندی دوطریقوں سے واضح ہوتی ہے:

جہت اولی: بیع کا انعقادہے، یعنی ان کی آپسی رضا سے اگر شرعی مخالفت نہ ہو تو بیع منعقد ہو جاتی ہے۔

جہت ثانیہ: اس عقد کا نتیجہ، یعنی اس پر مرتب ہونے والے مسائل، سامان پر قبض تاجیلا ہو گا یا معجل ہو گا وہ اس عقد کے منتھی ہونے پر ہے، اگر عقد ہو چکاہے تو اصل یہ ہے کہ اس پر قبض معجل ہو گا، ہاں طرفین کی رضا پر موخر ہو سکتاہے۔

اس طرح رضا بیع کے انعقاد اور قبض پر واضح ہوتی ہے، اوراس سے متعلق کچھ شروط ہیں جسے ان شاء اللہ پیش کیا جائے گا۔

یہاں ہم یہ عرض کریں گے کہ آپسی رضامندی سے بیع کچھ شروط پر منعقد ہوتی ہے:

پہلی شرط: آپسی رضامندی کسی طور سے بھی شرعی مخالفت میں نہ ہو، جیسے کہ کسی محرم بیع پر طرفین راضی ہو جائیں۔

مثلا خنزیر اور شراب کی بیع پر طرفین کا راضی ہوجانا، یہاں دونوں کی رضامندی کا کوئی اعتبار نہ ہو گا، کیونکہ یہ رضامندی اللہ تعالی کی شریعت کی مخالفت میں ہے۔

دوسری شرط: عقد میں جو ارادہ ہوتا ہے اس کے مناقض کوئی عمل اور ارادہ نہ ہو، اس پر انتباہ ضروری ہے کیونکہ فقہاء کی زبانی کتابوں میں یہ لفظ "مقصود العقد" بارہا آتے رہتاہے، اورآگے بھی ہماری گفتگو میں اس کا ذکر آئے گا ان شاء اللہ۔ تو فقہاء کی زبانی یہ "مقصود العقد" بہت معنی خیز ہے، کیونکہ بیع میں سب سے بڑا مسئلہ یہی "مقصود العقد" ہے۔

ABM Print Time

مثلا: عقد البیع میں اصل کیا ہوتا ہے؟ یہی کہ اس سے ملکیت حاصل ہو جائے، انسان اسی لئے خریداری کرتا ہے کہ اس سے وہ اس شے کا مالک بن جائے، اگر رضا اس میں بیع کے منافی ہو تو پھر یہ جائز نہیں ہے، اگر رضامندی ہی اس بات پر ہو کر مشتری اس پر مالک نہیں بن سکے گا، تو جائز نہیں ہے۔

کسی بائع نے کہا کہ میں ایک ہزار ریال پر تمہیں یہ سامان فروخت کرتا ہوں اور اس شرط پر کہ تم اس کے مالک نہیں بن سکوگے، یہ عقد صحیح کے منافی ہے، گویا اس میں صرف ظاہری ڈھانچہ ہے، اصل مفقود ہے۔

بیع سے ہٹ کر ایک اور واضح مثال یہاں پیش کی جائے گی کہ ایک شخص نے ایک نوجوان سے کہا: میں تم سے میری بیٹی کی شادی کرنے جارہا ہوں اس شرط پر کہ تم اس کو طلاق دے دوگے، اس سے عقد ہوتا ہی نہیں ہے بلکہ عقد کے منافی امر ہے۔

نتیجہ یہ کہ عقد میں ایسی رضا نہ ہو جو عقد کے مناقض ہو۔

تیسری شرط: اس میں ایسی شرط بھی نہ ہو جس سے شرعی طور سے اس رضا کو ختم کرنا پڑے، اس کی وضاحت کے لئے دو مثالیں پیش کی جارہی ہیں:

پہلی مثال: سلطان کا اس شخص کو اپنے مال میں سے کچھ کی بیع پر جبر کرے اس لئے کہ اس سے اس کا قرض پورا ہو جائے، ایک شخص پر قرض ہے لیکن اس کے پاس مال نہیں ہے، البتہ کچھ گھر ہیں اس کا وہ مالک ہے، ایسے میں سلطان یا اس کا نائب قاضی اس کو جبرا اس گھر کے بیع پر آمادہ کرتے ہیں، تو یہ گھر بکراہت فروخت کر دیتا ہے، یہاں شرعی طور سے اس بیع کو ختم کیا جاتا ہے، تاکہ ہر کسی کو اس کا حق پورا پورا ملے۔

دوسری مثال: تجار کا کسی سامان سے متعلق بیچنے سے روکے رکھنا جب کہ لوگ اس کے محتاج ہوں، اور پھر جب بیچنے پر آئیں تو اس کی قیمت سے بڑھ کر اسی جیسی زائد رقم لینا۔ جیسے ہمارے ہاں چاول کا معاملہ ہے، اگر تجار اس کی بیع سے ہاتھ روک لیں اور بیچیں تو دس ریال کی زائد رقم سے، تو ایسی صورت میں سلطان یا ان کے نائب پر یہ ضروری ہے کہ ان تجار کو اصل قیمت پر بیچنے کا پابند بنائیں، تاکہ لوگوں پر کسی طرح کا ظلم نہ ہو، یہاں اس اعتبار سے تجار کو ان کی عدم رضا پر بیع کرنے کے لئے مجبور کیا جائے گا، شرعی طور سے یہی صورت اختیار کرنا ہے اس لئے یہاں رضا کا اعتبار نہ ہو گا۔

شرعی طور سے کچھ دلائل ہیں جو اس قاعدہ کے لئے دلیل ہیں جس میں رضا کو اعتبار کیا گیا ہے۔ انہیں دلائل میں سے اللہ تعالی کا فرمان ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ﴾(النساء: 29) آیت کریمہ میں اللہ تعالی از طریق تجارت مال حاصل کرنے کے لئے رضا کی شرط لگائی ہے۔

انہیں دلائل میں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان: «إِنَّمَا الْبَيْعُ عَنْ تَرَاضٍ»[22]۔ اس حدیث کو ابن ماجہ اور ابن حبان نے روایت کئے ہیں، اور شیخ البانی رحمہ اللہ نے صحیح کہا ہے، اس حدیث مبارکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع کے حلال ہونے کو رضامندی پر حصر کیا ہے، اس میں وجہ الدلالہ ظاہر ہے، یوں یہ قاعدہ منصوص ہے، کہ بیع کسی طور سے بھی رضامندی پر قائم ہونا چاہیے۔
انہیں دلائل میں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان: «لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ يَعْنِي مُسْلِمًا إِلَّا بِطِيبٍ مِنْ نَفْسِهِ»[23]۔ اس روایت کو امام احمد رحمہ اللہ نے صحیح سند سے روایت لائے ہیں، یہ حدیث بھی رضامندی ہونے کی شرط پر دلیل ہے، اس لئے کہ اطمینان قلبی رضا سے ہوتی ہے۔
اہل علم کا اس پر اتفاق بھی ہے کہ رضامندی بیع میں اصل کی حیثیت رکھتی ہے۔
اب یہاں یہ معلوم کرنا ہے کہ رضا کے حصول کے لئے دو رکن ہیں:
پہلا رکن: علم ہے۔ یعنی جس کو اس کا علم نہ ہو اور اس کے مفہوم سے جو واقف نہ ہو تو اس سے رضا کیسے ہو گی، اس لئے رضا کے لئے علم کا ہونا ضروری ہے۔
اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص انڈونیشیا ملیشیا یا امریکہ وانگلینڈ یا پھر کسی بھی مقام سے ہمارے اس شہر آیا، یہاں کے شخص نے کہا: تم تمہاری کار فروخت کر دو- اور وہ شخص ہے کہ عربی سے واقف نہیں ہے- تو وہ شخص عربی کے کچھ کلمات سے یہ اپنی زبان میں یا پھر اشارۃ رضامندی سے ہاں بھر دی، جب کہ اس نے اس بات کو سمجھا ہی نہیں، تو یہاں یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس بیع سے یہ راضی ہے اور دونوں کے مابین ایجاب وقبول ہو چکا ہے، اس نے کار مانگی اور اس نے انگریزی میں ہاں کہہ دیا۔ تو اس سے بات نہیں بنے گی کیونکہ اس نے معنی ہی نہیں جانا جس سے بیع پوری ہو جائے۔ تو علم یہ پہلا رکن ہے۔

---

[22] - من حديث أبي سعيد الخدري رضي الله عنه، وصححه العلامة الألباني رحمه الله في " الإرواء " وغيره.

[23] - عن عم أبي حرة الرقاشي، وجاء هكذا عن أبي حميد وابن عباس رضي الله عنهم، صححه الألباني في الإرواء، لكن إسناد أحمد فيه " علي بن زيد " وهو " ابن جدعان " وهو ضعيف، فسند أحمد ليس بصحيح وهو بلفظ " بطيب نفس منه ".

ABM PrintTime

دوسرا رکن: اختیار ہے۔ انسان کا مختار ہونا ضروری ہے، اس کے بغیر بیع منعقد نہیں ہو گی ساقط ہو جائے گی۔

ان دو رکن سے بہت سارے مسائل وابستہ ہیں:

بیع کی شروط میں اصل صحت ہے، تا کہ طرفین راضی ہو سکیں۔ اس قاعدہ سے متعلق ہم آگے تفصیلی گفتگو کریں گے، اور شروط التعلیق اور شروط التقیید پر بھی گفتگو ہو گی، آگے ہم یہ بھی بیان کریں گے کہ بیع میں اصل صحت ہے۔

یہاں ہم ایک مسئلہ بیان کریں گے جو کہ بہت سارے طلبہ سے مخفی ہے، اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول کا صحیح معنی، آپ کا فرمان ہے: «إلاَّ شَرْطًا حَرَّمَ حَلاَلاً أَوْ أَحَلَّ حَرَامًا»[24]۔ میری مراد حدیث کا دوسرا فقرہ ہے، «حرَّم حلاَلاً»۔ اس کو اکثر طلبہ غلط معنی میں سمجھے ہیں، اس کو بہت جلد ایک قاعدہ کی روشنی میں پیش کریں گے ان شاء اللہ۔

مذکورہ قاعدہ سے مستنبط مسائل میں سے یہ بھی ہے کہ بیع میں خیار ہونا چاہیے تاکہ طرفین راضی ہو سکیں، تاکہ بیع منعقد ہو سکے۔ اور آپ کے علم میں یہ بات تو ہے کہ خیار سے بیع منعقد ہوتی ہے اس کے بغیر نہیں۔

اسی میں یہ بھی ہے کہ جمہور اہل علم کے نزدیک کراہت پر کی جانے والی بیع منعقد نہیں ہوتی ہے، اگر کسی کو اس کے گھر بیچنے پر مجبور کر دیا جائے تو یہ بیع جائز نہیں ہے، جمہور کی یہی رائے ہے البتہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی رائے اس سے مختلف ہے۔ جب کہ صحت رضا پر ہے اکراہ پر نہیں، اللہ تعالی کا فرمان ہے: ﴿إِلاَّ مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ﴾(النحل: 106)۔ اکراہ پر بات ختم ہو جاتی ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے: «إِنَّ اللَّهَ وَضَعَ عَنْ أُمَّتِي الْخَطَأَ، وَالنِّسْيَانَ، وَمَا اسْتُكْرِهُوا عَلَيْهِ»[25]۔ اس حدیث مبارکہ امام ابن ماجہ اور حاکم نے روایت کیا ہے، امام نووی حسن اور شیخ البانی نے صحیح کہا ہے، اللہ تعالی ان سب پر رحم فرمائے۔

ہمارا یہ قول کہ اس کے حق کے بغیر اس پر اکراہ کیا جائے، اس سے متعلق گفتگو اوپر گذر چکی ہے، سلطان کا کسی پر اس کے حق کے حصول کے لئے بیع پر اکراہ کرے، ایسے میں بیع منعقد نہیں ہوتی ہے۔

ایک مسئلہ ہے جسے فقہاء بکراہت ہونے والی بیع سے متعلق بیان کیا ہے، بطور فائدہ کے میں یہاں اس کو ذکر کروں گا۔ اور وہ مسئلہ ہے: اگر کوئی انسان کسی طرح مجبور کر دیا جائے کہ وہ اس چیز کو لے، ایسی صورت میں وہ اپنی مالیات میں سے کسی کو بکراہت فروخت کرے گا تا کہ وہ چیز اس کو حاصل ہو جائے، یہاں متنبہ ہونے کی ضرورت ہے کہ اس شخص کو بیع پر نہیں کسی اور چیز کے حصول پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ مثلا ایک ظالم نے ایک مسلم سے کہا کہ تم مجھے ایک لاکھ ریال لا کر دو ورنہ میں تمہیں قتل کر دوں گا، یہاں اکراہ ایک لاکھ ریال کے

---

[24] - رواه الترمذي من حديث عمرو بن عوف المزني ضي الله عنه، وصححه العلامة الألباني بمجموع طرقه.

[25] - من حديث ابن عباس رضي الله عنهما.

ABM Print Time

لئے ہے،اور یہ شخص مسکین ہے اس کے پاس ایک لاکھ ریال نہیں ہیں لیکن اس کے پاس گھر ہے،وہ اب گھر فروخت کرنا چاہتا ہے تا کہ مال حاصل کرے،تو کیا کسی مسلمان کے لئے یہ گھر اس سے خریدنا جائز ہے؟

میں دوبارہ آپ کو انتباہ ہونے کی تلقین کرتاہوں کہ اکراہ بیع پر نہیں ہے،اگر بیع پر ہوتا تو ہم کہتے کہ یہ منعقد نہیں ہوگی،لیکن یہاں اکراہ کسی اور شے پر ہے،اب یہ گھر فروخت اس لئے کرنا چاہتا ہے کہ اس سے مال مل جائے،اب ایک مسلم کا یہ خریدنا کیسا ہے؟

اہل علم کہتے ہیں کہ اگر مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ اگر کوئی گھر نہیں خریدے گا تو یہ اکراہ ویسے ہی ختم ہو جائے گا تو اس سے شراء کرنا حرام ہے۔یعنی یہ گھر بیچے گا اور مال حاصل کرے گا تبھی ظالم لے گا ورنہ معاملہ ختم۔تو کسی مسلم کی خریداری حرام ہے اس لئے کہ دفع الظلم واجب ہے۔

اور اگر نہیں معلوم ہے تو اس کی خریداری پر مجبور کیا جائے گا،اس لئے کہ ایک مسلم کی اعانت ضروری ہے۔کسی طور سے بھی مال سے ،منصب اور اثرورسوخ کسی بھی طرح اس کی مدد کی جائے گی۔اسی لئے فقہاء کہتے ہیں کہ اس کی مدد کرنا مستحب ہے،اس کے مال کی خریداری پر مجبور بھی کیا جائے گا۔

خلاصہء کلام یہ ہے کہ اگر مسلم کو معلوم ہو جائے کہ نہ خریدنے پر ظلم مندفع ہو جائے گا تو شراء حرام ہے،اگر معلوم نہیں ہے اعانت مستحب ہے اور شراء پر مجبور کیا جائے گا۔

ABM Print Time

طلبہ کے سوالات

ABM PrintTime

امارات سے ایک صاحب نے سوال کیاہے کہ شیخ محترم اگر ہم یہ کہیں کہ طلاق کی نیت سے کیاجانے والا نکاح جائز نہیں ہے، تواس سے کیاوہ زناشمار ہوگایاصرف آثم ہوگا؟

جواب: طلاق کی نیت سے نکاح کرناہمارے نزدیک جائز نہیں ہے، برخلاف جمہور اہل علم اور کچھ کبار مشائخ کے کہ ان کے ہاں ظاہر کاخیال کرتے ہوئے جائز ہے۔ لیکن مقاصد کے پیش نظر ہم عدم جواز کے قائل ہیں جسے ہم نے پیش کیاہے۔ اس کی کچھ اور بھی وجوہات ہیں، جن میں سے ایک بھی کہ اس میں عورت کے ساتھ دھوکہ بھی ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع میں دھوکہ سے منع فرمایاہے۔ تو نکاح میں بدرجہ اولی غرر ممنوع ہے۔

ایک عورت مرد سے تاحیات شادی کی نیت رکھتی ہے، اور وہ ہے کہ طلاق کاارادہ مخفی رکھاہے، اگر غرر نہ بھی ہو تو اس کو چاہیے کہ وہ اس بات کوواضح کرے کہ وہ نیت طلاق سے شادی نہیں رچارہاہے۔ ورنہ وہ نکاح متعہ کہلائے گا۔

یہ معاملہ دوحالتوں سے خالی نہیں ہے:

یاتووہ خاتون یہ نہیں جانتی ہے کہ وہ طلاق کی نیت سے شادی کررہاہے، تو یہ اس کے ساتھ دھوکہ ہے اور حرام ہے۔

اور اگر جانتی ہے تووہ نکاح متعہ ہے۔

اور چونکہ اس میں ایک خاتون کے حق میں ضرر ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «لاَ ضَرَرَ وَلاَ ضِرَارَ»[26]۔ اور یہ شخص ایک عورت کے ساتھ جو کہ کنواری ہے اس کے ساتھ چند ایام تک رہتاہے، اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ محض کچھ ایام اس کے ساتھ بتانے ہیں، تو یہ عقد نکاح میں اس کے حق میں ضرر ہے، پھر اس کو ثیبہ بناکر چھوڑدیتاہے، اور ثیبہ اور باکرہ دونوں برابر نہیں ہوسکتے ہیں، اس اعتبار سے یہ عورت کے حق میں ضرر ہے۔

ہمارے کہنے کامقصد یہ ہے کہ اگر وہ عقد نکاح میں ہے طلاق کاارادہ رکھتاہے تو یہ اضرار ہے، جب کہ کسی حادثہ کی وجہ سے طلاق دیتاہے تو وہ اضرار نہیں ہوگا۔

اس طرح کے نکاح سے عورت کئی طرح سے نقصان میں رہتی ہے، جیسے نفسیاتی طور سے بھی پریشان رہتی ہے، جس سے پھر نکاح کی طرف رغبت نہیں رکھتی، کبھی تو مرد جس دین پر ہے اس سے بھی متنفر ہوجاتی ہے، جیسے کہ کچھ مسلم خواتین دین اسلام سے مرتد ہوگئی وجہ صرف اس طرح کے حادثات ہیں۔ اسی طرح مسلم خواتین کو یہ مسئلہ اگر کسی صالح مرد سے پیش آجائے تو اس کو صالحین سے نفرت ہوجاتی ہے، اور وہ اس طرح کے افعال کو ان سے جوڑنے لگتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب عظیم نقصانات میں سے ہے، جس سے شریعت منع کرتی ہے، اسی بنیاد پر ہم اس کے عدم جواز کا فتوی دئے ہیں۔

---

[26] - صفحہ نمبر ۱۱ میں دیکھئے۔

ABM Print Time

لیکن اگر وہ منعقد ہو جائے تو ہم اس کو زنا نہیں کہیں گے، البتہ منع ضرور کریں گے، اگر کوئی اس نیت سے نکاح کرنے کے بعد ہم سے سوال کرے تو ہم اس سے یہی کہیں گے کہ اس خبیث نیت کو چھوڑ دو اور نکاح کو باقی رکھو۔ کیونکہ آپ کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ آپ کسی عورت کو نقصان پہنچاو۔ تو ہم اس کو زنا نہیں کہیں گے، ہاں وہ حرام کا مرتکب ضرور ہوا ہے۔

ABM PrintTime